بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بیادِ بیدل حیدری

انٹرنیشنل

ادب و ثقافت

12

مدیران

شکیل سروش ، شیخ اعجاز

معاون مدیر

طارق محمود ہاشمی

برائے رابطہ (شکیل سروش)

Phone:+414-943-7000, +414-943-5594
E-mail:adabosaqafat@gmail.com
shakeelsarosh@gmail.com

برائے رابطہ (شیخ اعجاز)

178-Bamboo, Ave, SE., Palm Bay, FL.32909, U.S.A.
Phone:321-674-9837
Sheikh.ijaz.ahmed@gmail.com

www.adab-o-saqafat.com

مجلسِ مشاورت

ڈاکٹر حقی حق، حسن عباسی، ناصر بشیر، اذلان شاہ

زیرِ اہتمام

اَدب وثقافت، امریکہ

Adab-o-Saqafat, USA.

اپنی نگارشات بھجوانے کے لیے

بذریعہ ای میل

adabosaqafat@gmail.com
shakeelsarosh@gmail.com

بذریعہ ڈاک (امریکہ)

178-Bamboo, Ave, SE., Palm Bay,
FL.32909, U.S.A.

بذریعہ ڈاک (پاکستان)

ادب وثقافت

پوسٹ آفس روڈ، چیچہ وطنی (ساہیوال)

ناشر

محمد عابد

مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور بازار، فیصل آباد، پاکستان

Phone:+92 412615359- 2643841, Cell:0333-9933221
E-mail:misaalpb@gmail.com

قیمت: 200 روپے

فہرست

○ حمد ظفر عجمی ۷ ○ نعت خالد رُومی ۸

مضامین

محبتوں کے استعاراتی نظام کا شاعر ڈاکٹر طاہر تونسوی ۹

آئینۂ غزل میں عکسِ انساں [وؔلی سے آتؔش تک] طارق ہاشمی ۱۶

فیض احمد فیضؔ اور فارسی شعرا سیّد وقار حیدر ۳۱

نظمیں ۴۳

□ کیتھی سانگ کی نظمیں (ترجمہ: محمد حمید شاہد) □ مجھے سوچنے دو (مظہر بخاری)

□ وہ صاحبِ اجمیر نگر کیسا لگا ہے؟ (ناصر بشیر) □ سچ کے لیے پہلے سفر کی تمہید (خاور جیلانی)

□ ایک چہرہ! (سرور عالم راز سرور) □ آسیب (شکیل سالک)

افسانے

تھوتھن بھنورا محمد حمید شاہد ۵۵

ہجرت کا بہی کھاتہ جعفر حسن مبارک ۶۳

جواز اسد محمود خان ۷۵

غزلیات

آفتاب احمد ۸۱ — احمد خیال ۸۳ — احمد طلال آصف ۸۴

احمد نشاط ۸۵ — اختر رضا سلیمی ۸۶ — ارشاد جالندھری ۸۷

اسلم سحاب ہاشمی ۸۸ — اطہر ناسک ۸۹ — افضل خان ۹۰

افضل گوہر ۹۱
اقرار مصطفیٰ ۹۲
امتیاز علی گوہر ۹۳
باقی احمد پوری ۹۴
پروین نقش ۹۵
تنویر سیٹھی ۹۶
حسن عباسی ۹۷
خالد ملک ساحل ۹۸
دستگیر قمر ۱۰۰
ڈاکٹر شکور الرحمٰن ۱۰۱
راحت نذیر راحت ۱۰۲
سرور عالم راز سرور ۱۰۳
سرور ارمان ۱۰۴
سعداللہ شاہ ۱۰۵
سیّد اذلان شاہ ۱۰۷
سیّد انصر ۱۰۸
شکیل سالک ۱۱۰
شکیل سروش ۱۱۱
شہزاد احمد ۱۱۲
شہزاد اسلم ۱۱۴
شیخ اعجاز ۱۱۵
ضیاء پرویز ۱۱۷
ظفر اقبال ۱۱۸
ظفر عجمی ۱۲۰
عاصم اقبال عاصم ۱۲۲
عمران شناور ۱۲۳
فاروق ماہر ۱۲۴
فرتاش سیّد ۱۲۵
محمد افتخار شفیع ۱۲۶
محمد اکرام الحق قاسمی ۱۲۷
محمد آصف مغل ۱۲۸
مظہر بخاری ۱۲۹
ناصر ملک ۱۳۰
نصرت صدیقی ۱۳۱
واصف سجاد ۱۳۳
یونس اعجاز ۱۳۴

اداریہ

''ادب وثقافت'' انٹرنیشنل کا تازہ شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ اِس ادبی وثقافتی سفر کے ہر پڑاؤ پر کچھ نیا کرنے کی آرزو ہمیشہ سے رہی ہے اور ہر پڑاؤ پر خیمہ زن ہوکر اِس آرزو کی تکمیل میں تخلیقی کام کی جس قدر رجع آوری ممکن ہوتی ہے، وہ آپ کی بصارتوں بلکہ بصیرتوں کی نذر کردی جاتی ہے، اُمید ہے تخلیقی عمل کو جِلا بخشنے کی یہ تازہ کوشش آپ کی توقعات سے مطابقت کا سامنا ہوگی۔

جہاں تک اُردو ادب میں تازہ تخلیقی رجحانات کے سماجی پس منظر کا تعلق ہے تو حالات بیان کرنے کے بجائے اُن پر نوحہ زنی کے نشانات آپ کو تازہ شمارے کے شعری اور افسانوی سرمائے میں واضح نظر آئیں گے۔ عالمی سطح پر دہشت اور خوف کو ختم کرنے کے لیے دہشت اور خوف ہی کو پھیلایا جارہا ہے۔ نہیں معلوم انسانی مساوات کا نعرہ لگانے والے انسانوں کو برابر کردینے کے منشور پر کیوں عمل پیرا ہیں۔

وطنِ عزیز کے ہر گوشے میں آگ اور خون کا فروغ کئی ایک حیلوں بہانوں سے جاری ہے۔ کراچی، کوئٹہ، پشاور اور لاہور ہر جگہ کشت خون کا ایک نیا بہانہ موجود ہے۔ اِن حالات میں اربابِ بست وکشاد سے کوئی اُمید باندھنا بھی لایعنی لگتا ہے اور دُعاؤں میں اثر کیوں نہیں رہا۔ یہ ایک الگ

رُوحانی المیہ ہے۔ پھر بھی ہاتھ بلند ہیں اور اُس ذات کے حضور سر جھکے ہوئے۔

تازہ شمارے میں شعری تخلیقات کی اشاعت شعر کے نام کے حرفِ ہجا کے لحاظ سے ہے۔ یہ قدم بعض بدگمانیوں کو رفع کرنے کے ساتھ ساتھ حُسنِ ترتیب کے پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے بھی اُٹھایا گیا ہے۔

مُدیران

حمد

—ظفر عجمی—

ہر دم ہے اُس کا اسم مبارک زباں پہ اب
ہونے لگا ہے ذِکر مرا آسماں پہ اب

دُنیا کے حُسنِ خام پہ جاتی نہیں نظر
ہے دِل کو اعتبار اُسی جان جاں پہ اب

میری بساط کیا ہے؟ یقیں اپنی ذات کا
جاری کیا ہے آپ ہی میرے گُماں پہ اب

یہ کون کر رہا ہے مِرے باوفا کا ذِکر
نکلا ہوں گھر سے صبح کی پہلی اذاں پہ اب

سب جاہ و مال اُس کی محبت میں ہار کے
نظریں لگی ہیں اُس کے رُخِ زرفشاں پہ اب

اب غمگسار ہجر ہے اِک مہرباں سی یاد
اِک شبنمی سا لمس ہے قلب تپاں پہ اب

جب سے بسی ہے اُس کی محبت نگاہ میں
اِک نور سا برستا ہے کون و مکاں پہ اب

سینوں میں دِل اُچھلنے لگے ہیں فقیروں کے
رکھا ہے اُس نے تیرِ محبت کماں پہ اب

منزل سمجھ لیا ہے ظفؔر اُس کی راہ کو
اور ہم نے کر لیا بسیرا یہاں پہ اب

نعت شریف

—خالد رُومی—

بڑھ گئے زِیست کے پیچاک ، مدینے والےؐ!
رنج کے ہاتھوں ہوں نم ناک ، مدینے والےؐ!

اِس طرف بھی نگہِ پاک مدینے والےؐ!
اے مرے سیّدِ لولاک ، مدینے والےؐ!

دولتِ عشقِ خداوند سے ہو جائے غنی
یہ مرا سینۂ صد چاک ، مدینے والےؐ!

آپؐ کی خاکِ کفِ پا سے ہیں تارے روشن
آپؐ ہیں زینتِ افلاک ، مدینے والےؐ!

سربسر ایک تجلّی ، ترا پیکر آقاؐ!
میری ہستی خس و خاشاک ، مدینے والےؐ!

جذبۂ شوق کو ہو وسعتِ صحرا سا فروغ
میرا محدود ہے فتراک ، مدینے والےؐ!

آپؐ کی شانِ علیٰ کو نہ تصوّر پہنچا
دم بخود ہو گئے اِدراک ، مدینے والےؐ!

قلزمِ نعت میں ہو کاش سدا غوطہ زَن
ایک میرا دِل تیراک ، مدینے والےؐ!

آپؐ کی یاد غذا ہو دِلِ رُومؔی کی حضورؐ!
آپؐ کا عشق ہو پوشاک ، مدینے والےؐ!

محبتوں کے استعاراتی نظام کا شاعر

-ڈاکٹر طاہر تونسوی-

ہم عصر اُردو شاعری میں اپنے اسلوب اور موضوعات کے تناظر میں حسن عباسی بلاشبہ ایک اہم نام ہے اور اس نے اپنی تخلیقی فعالیت اور فنی صناعیت کے حوالے سے اہلِ نقد ونظر سے اپنے آپ کو نہ صرف تسلیم کرایا ہے بلکہ وہ ان کی صف میں پورے قد سے کھڑا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ محبتوں کا شاعر ہے اور اس کے ہاں محبتوں کا اِستعارہ ایک مکمل فکری اور فنی نظام کے تحت اُردو شاعری کے اُفق پر اُبھرا ہے۔ اس کا پہلا شعری مجموعہ ''ہم نے بھی محبت کی ہے'' پہلی بار اگست ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا اور اس کا چوتھا ایڈیشن ۲۰۰۴ء میں چھپا۔ اس کا دوسرا شعری مجموعہ ''ایک محبت کافی ہے'' پہلی بار ۲۰۰۵ء میں منظرِ عام پر آیا اور اس کا پانچواں ایڈیشن ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔ اس کا تیسرا مجموعہ ''اِک شام تمہارے جیسی ہو'' جنوری ۲۰۱۰ء میں چھپا۔ اس کے تینوں شعری مجموعوں سے صائمہ ملک نے انتخاب کر کے ''وہ آنکھ کتنی شرارتی ہے'' کے نام سے مرتب کیا اور اس کی اشاعت مئی ۲۰۱۰ء میں ہوئی۔

حسن عباسی کی شعری کائنات کے حوالے سے مَیں نے اُسے محبتوں کے استعاراتی نظام کا شاعر قرار دیا ہے اور وہ جو کہتے ہیں کہ ''نام ہی کافی ہے'' تو حسن عباسی کے تینوں مجموعے اور ان سے انتخاب محبتوں کی کہانی بیان کرتے ہیں اور اپنے ناموں کی معنویت کا بھرپور اظہاریہ بھی ہیں۔ حسن عباسی نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی ہے کہ

ایک محبت کافی ہے
باقی عمر اضافی ہے

یوں دیکھا جائے تو محبت کے حوالے سے کہی گئی غزلیں حسن عباسی کے رومانی اور جمالیاتی طرزِ احساس کی آئینہ داری کرتی ہیں اور اس نے محبت کے عظیم جذبے کو کہیں کہیں جذباتی اور کہیں کہیں

غیر جذباتی انداز میں بیان کیا مگر جذباتی اور غیر جذباتی رویوں کے درمیان ایک ایسا نازک سا مربوطی رشتہ ہے جو اپنے دائرے کے باہر نہیں نکلتا اور اس طرح شاعر کا فکری رجحان ایک ایسا مستقل زاویہ بناتا ہے اور ایک ایسا تخلیقی سمندر رواں دواں کرتا ہے جس کا بہاؤ اور اس سے پیدا ہونے والی لہریں ایک ہی نقطے پر مرکوز رہتی ہیں۔ محبت کے موضوعات کے حوالے سے ثابت قدمی اس کے ہم عصروں میں کم نظر آتی ہے اور پھر اس متنوع اور ناپیدا کنار موضوع کو نئے لفظوں اور نئے حرفوں سے بیان کرنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا ہے۔ چھوٹی بحروں میں مختصر مضمون کو بڑا بنانے کا فن اُسے آتا ہے اور اس کے کئی تخلیق کردہ مصرعے لفظ و معنی کی گرہیں کھول دیتے ہیں۔

وہ آنکھ کتنی شرارتی ہے

اس کا پیکر اپنے گھر لے آؤں گا

وہ پہلی ملاقات کا نقشہ نہیں جاتا

چاند جب اس کی یاد کا نکلا

ٹھہرے پانی میں جیسے جال گرے

بھیگتی آنکھیں کھڑکیاں اور انتظار

اُس نے مجھ کو اپنا چہرہ بھیجا ہے

اُس کی آنکھوں میں جب ٹھکانہ تھا

آنکھوں کی طرح راز ہے کھلتا بھی نہیں وہ

خواب اپنے میری آنکھوں کے حوالے کر کے

اب تو آنکھ سے اتنا جادو کر لیتا ہوں

جھرنا تو رواں آنکھ کا باہر کی طرف تھا

اُن کی آنکھوں کی اجازت مار دے گی

ہماری آنکھ کھلے کیسے آفتاب کے ساتھ

رات یہ کون مرے خواب میں آیا ہوا تھا

پھر وہ چہرہ میری آنکھوں میں نظر آتا ہے

ہر طرف پھیلی تھی اُس کی یاد جنگل کی طرح

جلتا ہوا اک خواب یہاں چھوڑ کر جاؤں

آنکھوں کے آس پاس سمندر نہیں رہا

اشک آنکھوں میں چھپاؤں گا چلا جاؤں گا

ہمیں محبت نے ایک جیسا بنا دیا ہے

اُداس لوگوں میں خوش رہوں گا

آنسو لے کر آیا ہوں الفاظ نہیں

اپنی آنکھیں کسی کاغذ پر بنا کر جاؤں

گھر میں سرخ آنکھوں کے پھول کھلتے جاتے ہیں

خواب کے کوچۂ مسمار کو رو بیٹھے ہیں

آنکھوں میں چہروں کے پھول کھلا جاتی ہے

صرف دو آنکھیں ملیں آنسو بہانے کے لیے

شہروں شہروں گلیوں گلیوں پیار کے دیپ جلاؤں

حسن عباسی کی تخلیق کردہ غزلوں کے جو مصرعے میں نے چنے ہیں۔ یوں سمجھیے کہ بہار رت میں گلابوں کے کھلنے کا منظر نامہ پیش کرتے ہیں اور اس میں جو الفاظ بار بار آئے ہیں وہ اپنی بھرپور معنویت اور شعر کے دونوں مصرعوں کے ساتھ مکمل ہم آہنگی اور ربط رکھتے ہیں اور یہی حسن عباسی کا فنی کمال ہے کہ وہ لفظ کے ساتھ معنی کا رشتہ جوڑتے ہیں اور مفاہیم کو الگ نہیں ہونے دیتے یہ سارے لفظ جن کے اوپر میں نے لائن لگائی ہے اس کے استعاراتی نظام کی نشاندہی کرتے ہیں اور محبتوں کی ایک مکمل کہانی بیان کرتے ہیں کہ جس میں وہ سب کچھ موجود ہے جو محبتوں کے مراحل میں صحراؤں سے گذرنے والے مسافروں کو پیش آتا ہے اور پھر وہ تجربات بھی ہیں جو اس عظیم جذبے کی پل پل کی داستان سناتے ہیں اور ظاہر ہے کہ حسن عباسی نے محض لفظوں کے تیر نہیں چلائے اور نہ ہی ہوا میں چراغ جلائے ہیں بلکہ وہ خود بھی انہیں راستوں پر چلے ہیں اور انہیں کیفیات اور اس کی حسیات کو لفظوں کا ملبوس

عطا کیا ہے جو محبت سے مختص ہیں۔ میں نے حسن عباسی کی غزلیات کے جو مصرعے چنے ہیں وہ یہ دعوت دیتے ہیں کہ آپ حسن عباسی کے دونوں مصرعوں کو پڑھیں تا کہ آپ پر ان کی تہہ داری بھی کھلتی جائے اور لطافتِ فکر و خیال بھی آپ کے دل و دماغ پر تاثریت پیدا کرتی چلی جائے اور یوں آپ پر حسن عباسی کے کمالِ فن کے در یچے بھی وا ہوتے جائیں اور اس کی صناعی کا ہنر بھی کھلتا چلا جائے۔ اس تناظر میں آنکھ، پیکر، ٹھہرے پانی، خواب، یاد، سمندر، محبت، اشک، اُداس، آنسو، پھول، پیار کی طرح کے کومل اور نرم الفاظ ہر شعر میں نئی صورتِ حال کو پیش کرتے ہیں اور پڑھنے والے کو اپنے طلسم میں جکڑ لیتے ہیں اور وہ آنکھیں بند کر کے اُن سپنوں میں کھو جاتا ہے جو اس نے کبھی کھلی یا بند آنکھوں سے دیکھے ہیں اور پھر یادوں کا جنگل اس کی آنکھوں کے گرد اس طرح گھیرا کر لیتا ہے کہ وہ خود کو حسن عباسی کے شعروں کی اثر آفرینی میں ڈھال لیتا ہے۔ دُکھ اور سکھ کی یہ رام کہانی جاگتی آنکھوں کے خواب کی ہے اور پھر میر تقی میر کی طرح سراب کی سی بھی ہے۔ اس طرح ہم نے بھی محبت کی ہے۔ ایک محبت کافی ہے اور اک شام تمہارے جیسی ہو کی اکائی بھی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ حسن عباسی نے ان تمام جذبوں کو ایک کر کے ان کی ایک مکمل لفظی تصویر بنا دی ہے اب ذرا ان کی پیکر تراشی کو دیکھتے ہیں اور حسن عباسی کی محبت کے پردے میں اس کی ذات کو تلاش کرتے ہیں۔ آنکھ کے حوالے سے اس کی غزل کی یہ چند شعر ایک محسوساتی کیفیت کو اُبھارتے ہیں۔

خموش رہ کر پکارتی ہے — وہ آنکھ کتنی شرارتی ہے
میں بادلوں میں گھرا جزیرہ — وہ مجھ میں ساون گذارتی ہے
ہے چاندنی سا مزاج اس کا — سمندروں کو اُبھارتی ہے
کہ جیسے میں اُس کو چاہتا ہوں — کچھ ایسے خود کو سنوارتی ہے
خفا ہو مجھ سے تو اپنے اندر — وہ بارشوں کو اُتارتی ہے

آنکھ کے استعارے کے حوالے سے یہ اشعار دیکھیے:

سمندروں کے مسافر تھے دربدر رہتے
تمہاری آنکھ نہ ہوتی تو ہم کدھر رہتے

کبھی جو آنکھوں کے آ گیا آفتاب آگے
ترے تصور میں ہم نے کر دی کتاب آگے

جہاں جائیں ان آنکھوں میں ہے بس دیوار و در اپنا
سفر میں بھی لیے پھرتے ہیں ہم تو ساتھ گھر اپنا

چلو ہم بھی محبت کر ہی لیں گے
اگر اس کا ارادہ ہو گیا ہے

عرصہ ہوا اس آنکھ میں جھانکے ہوئے لیکن
اس آنکھ کی تاثیر کا نشہ نہیں جاتا

خواب میں جا کے اُسے دیکھ تو آؤں لیکن
اب وہ آنکھوں کے دریچوں میں کہاں رہتا ہے

اُس کی آنکھوں میں جب ٹھکانہ تھا
وہ زمانہ بھی کیا زمانہ تھا

اور اب خواب اور یاد کے حوالے سے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

تمہاری یاد اُترتی ہے اس طرح دل میں
کہ جیسے صحن میں بارش ہوا کے ساتھ اُترے

خواب اپنے مری آنکھوں کے حوالے کر کے
تو کہاں ہے مجھے نیندوں کے حوالے کر کے

شہر میں آ کر اپنا آپ بھول گیا ہوں
لیکن اک گاؤں کی لڑکی یاد آتی ہے

ہماری آنکھ کھلے کیسے آفتاب کے ساتھ
ہماری نیند جڑی ہے تمہارے خواب کے ساتھ

رات یہ کون مرے خواب میں آیا ہوا تھا
صبح میں وادیٔ شاداب میں آیا ہوا تھا

جلتا ہوا اک خواب یہاں چھوڑ کے جاؤں
جنگل میں کوئی اپنا نشاں چھوڑ کے جاؤں

روز اک خواب نے پاؤں سے سفر باندھا مگر
روز اک خواب کی تعبیر نے جانے نہ دیا

اوپر دیے گئے تمام حوالے غزل کے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ حسن عباسی غزل اور خالصتاً غزل کا شاعر ہے تاہم اس نے محبت کے دائمی اثرات کے تحت نظمیں بھی کہی ہیں اور اس میں بھی محبتوں کا ذائقہ موجود ہے۔ نظم ''Think Before'' کی چند لائنیں دیکھیے:

میرے گھر کو آنے والے
سارے رستے کچے ہیں
شام سویرے
ان رستوں پر دھول اُڑتی ہے
پھر بھی تم آنا چاہو تو
میں بھیگی آنکھوں سے رستہ دیکھوں گا

نظم ''آؤ ہاتھ اُٹھائیں'' کی چند لائنیں:

آؤ ہاتھ اُٹھائیں
اُس کی خاطر
جس نے شہرِ ادب کے دروازے پر
دستک دے کر یہ بتلایا
خواب دکھانے والے کی تکریم ہے کیا
شعر سنانے والوں کی تعظیم ہے کیا

نظم ''شب بخیر'' میں حسن عباسی کی سوچ کا زاویہ دیکھیے:

شب بخیر کہنے سے
نیند تو نہیں آتی
رات تو نہیں کٹتی
نیند آ بھی جائے تو
خواب آنے لگتے ہیں
رات بھر تو خوابوں میں

میرے ساتھ رہتے ہو
کس لیے مجھے پھر تم
شب بخیر کہتے ہو

حسن عباس کی یہ نظم اس کی محبتوں کے سلسلۂ اظہاریہ کی ایک مکمل عکس ریزی کرتی ہے اور وہ ہر لمحہ، ہر لحظہ اور ہر پل، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے محبت اور خالصتاً محبت کے تناظر، اس سے وابستہ یادوں اور اس سے پیوستہ خوابوں کا شاعر ہے۔ ایک ایسا شاعر جو اس جذبے کی تقویت کے لیے زندگی اور اس سے پیدا شدہ کیفیات کے ہر زاویے کے روشن امکانات کی فضا تخلیق کر رہا ہے اور یہی اس کا کسبِ ہنر بھی ہے اور کمالِ فن بھی!! اور اس کا یہ کہنا حرف بہ حرف سچ ہے:

ایک محبت کرنے والا مل جائے
اس سے بڑھ کر اور کوئی اعزاز نہیں

اور پھر

مرنا نہیں مر کر بھی قبروں میں اُتر کر بھی
نظموں میں رہیں گے ہم غزلوں میں رہیں گے ہم

اور میرے نزدیک یہی اس کی شاعری کے استعاراتی نظام کا منظر نامہ بھی ہے!!

☆:☆:☆

آئینۂ غزل میں عکسِ انساں

[ولیؔ سے آتشؔ تک]

–طارق ہاشمی–

اردو کے کلاسیکی شعرا کا معاشرہ اُن افراد پر مشتمل تھا جنہوں نے نہ تو پاسکل سے خدا کے کھو جانے کی خبر سنی تھی اور نہ ہی اُس عہد کی فضا میں نٹشے کا 'خدا کی موت' کا اعلان گونجا تھا۔ یہ معاشرہ وکٹورین سائنس اور فکرِ مغرب کے زیرِ اثر خود مکتفی ہونے کے زعم میں مبتلا نہیں ہوا تھا بلکہ اس کے تمام رنج و راحت اور وسائل و مسائل خدا اور تصورِ تقدیر سے وابستہ تھے۔ سیدھے سادے الفاظ میں یہ معاشرہ ''خدا مرکز معاشرہ'' تھا۔

اس معاشرے کی فکر کی بنیاد مذہب اور تصوف کے رجحانات تھے جن کی رو سے خالقِ ارض و سما خدا کی ذاتِ واحد ہے۔ حیاتِ انسانی فانی ہے، اور موت کے بعد ہم زندگی کا ایک نیا سفر شروع کریں گے جو اَبدی ہے۔ انسان اپنی موجودہ زندگی میں کیے جانے والے تمام اعمال و افعال کا حساب آخرت میں دے گا اور یہ خدائے رحیم کی رضا پر ہے کہ وہ انسان کو بخش دے یا اعمالِ بد کی سزا کے طور پر جہنم کے تاریک گڑھوں میں دھکیل دے۔ اس معاشرہ میں انسان کائنات اور خدا کا رشتہ ایک تسلیم شدہ رشتہ تھا۔ چنانچہ ہمارے اردو شعرا بھی مذہبی اور صوفیانہ عقائد کے زیرِ اثر ''زمین کی تکلیف اور جدائی کی کربناکی کا ذکر کرتے تھے۔ کیونکہ اُن کی نظر میں یہی ایک واحد طریقہ تھا جس کے زیرِ اثر آنے والی زندگی میں ہمارا نام نیک لوگوں میں شامل ہوسکتا ہے۔ وہ لوگ زمین پر روتے تھے تاکہ بہشتوں میں اُن کی مسکراہٹ یقینی ہو۔ وہ زمانہ اعتقاد کا زمانہ تھا اور وہ بزرگ خوش قسمت تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اُن کا اعتقاد سچائی پر قائم ہے آنے والی یہ زندگی حقیقت ہے۔''(۱)

یہ معاشرہ چونکہ خود مکتفی ہونے کے زعم میں مبتلا نہیں ہوا تھا لہٰذا انسان کے قدر و اختیار کا دائرہ بھی تنگ و محدود تھا۔ انسان اور کائنات کا ماضی خدا نے ترتیب دیا تھا۔ حال میں بھی وہی کارساز ہے اور مستقبل کی تشکیل بھی وہی کرے گا۔ بقول ڈاکٹر تحسین فراقی:

> ''(انسان) کے بارے میں اس دنیا میں دو بڑے تصورات رائج رہے ہیں، ایک اُس کے مختار ہونے اور دوسرا مجبور محض ہونے کا۔ ہماری کلاسیکی اُردو شاعری بیشتر اس دوسرے تصور کی موید اور علمبردار رہی ہے۔''(۲)

ان شعرا کے نزدیک انسان نیابتِ الٰہی کے منصب پر فائز، خدا کی تخلیق کا سرتاج اور اشرف المخلوقات ہے۔ انسان کا وجود کائنات کا مظہر ہے اور وہ ایک کون الصغیر ہے۔ اُس کے وجود میں ایک شمعِ اُمید روشن رہتی تھی۔ بلکہ نیابتِ الٰہی اور اشرف المخلوقات کا تصور اُس کے اندر ایک الوہی طاقت کو بھی اُبھارتا ہے۔

ولؔی ایک جمال پرست شاعر ہیں جو کائنات کے جمال میں سرمست رہتے ہیں۔ اُن کی شاعری کا تشبیہاتی نظام اس بات کی دلیل ہے کہ اُن کی شاعری کی بنیادی قدر ہے۔

حسن تھا پردۂ تجرید میں سب سوں آزاد
طالبِ عشق ہوا صورتِ انسان میں آ(۳)

ولؔی کا یہ شعر اُس عربی قول کی طرف دھیان دلاتا ہے جس میں خدا نے خود کو ایک خزانہ مخفی قرار دیتے ہوئے تخلیق کائنات کو اپنی ذات کا اظہار قرار دیا۔ ولؔی کے نزدیک انسان کائنات کے بارے میں بحث و تکرار کرتا ہے۔ لیکن موجودات کی حقیقت کا ادراک نہیں کرسکتا۔ وہ نہیں جانتا کہ اُس کے وجود کی اصل کیا ہے۔

اے بلبلِ زباں تو نہ کر اختیار بحث
ہے باغِ دہر میں گلِ آتش بہار بحث(۴)

اُن نے پایا ہے منزلِ مقصود
عشق جس کا ہے ہادی و رہبر(۵)

لہٰذا انسان کو ترکِ علائق کر کے عشق کی راہ پر گامزن ہونا چاہیے کیونکہ دل کی راہ وہ راہ ہے جو انسان کو اس کی حقیقت سے آشنا کرتی ہے۔ انسان خارجی کائنات کی بجائے اپنی داخلی کائنات کے مشاہدہ سے اپنی حقیقت کا ادراک جلد کرسکتا ہے۔ اس لیے انسان کو اپنی ذات کا عرفان ہونا چاہیے۔ اور یہ عرفان بے خودی کی راہ سے حاصل ہوتا ہے۔

دیکھا ہے یک نگہ میں حقیقت کے ملک کوں
جب بے خودی کی راہ میں دل نے سفر کیا(۶)

اوراسی راہ،ہی سے انسان خودآ گاہ ہونے کے ساتھ ساتھ خداآ گاہ بھی ہوجا تا ہے۔

سیر صحرا کی تو نہ کر ہرگز
دل کے صحرا میں گر خدا پایا(۷)

میؔر کے ناقدین کا خیال ہے کہ اُن کے کلام میں ''بلندش بغایت بلند اور پستش بغایت پست'' کی صورت نظر آتی ہے۔لیکن یہی وہ خوبی ہے جو کلامِ میر میں ایک پورے انسان کو تشکیل دیتی ہے اور میؔر نے اپنی شاعری میں انسان کی وہ شکل بھی دکھائی ہے کہ جہاں مسجودِ ملائک ہے اور اُس کی ''شانِ ارفع'' ہے۔لیکن دوسری طرف وہ انسان بھی نظر آتا ہے جو''اسفل سافلین'' ہے۔دراصل یہ دونوں حالتیں انسان کی فطرت کا حصہ ہیں۔محمد حسن عسکری کے خیال میں:

''(میر کے کلام میں) ہم زندگی کے صرف چند تجربات (خصوصاً لطیف تجربات) سے دوچار نہیں ہوتے بلکہ اُس کی شاعری میں ہمیں پوری زندگی ملتی ہے اور اپنے سارے تنوع اور تضاد، رفعتوں اور پستیوں، قوتوں اور مجبوریوں سمیت فکرِمحض کو شاعری میں سمونا بھی بڑی مشکل بات ہے۔''(۸)

لیکن میؔر جو ساری زندگی ''نامرادانہ زیست'' کرتا رہا۔اس مشکل گرہ کو بھی کھولتا رہا اور بقول سلیم احمد ''میؔر کے انسان کا کمال یہ ہے کہ لطافت و کثافت اس طرح گلے مل رہے ہیں کہ دونوں کا تعین باقی نہیں رہا۔میؔر کے عاشق کے روپ میں انسان کی یہ تصویر اب تک اردو شاعری کی معراج ہے۔''(۹)

اگرچہ میؔر انسان کی اول الذکر حیثیت کو پسند اور ثانی الذکر کو ناپسند کرتے ہیں لیکن وہ اس بات کا بھی احساس رکھتے ہیں کہ اگر انسان اپنے اندر کے اس تضاد کو ختم کردے تو وہ انسان، انسان نہیں رہ جاتا بلکہ خدا بن جاتا ہے۔اور شاید طبعِ میؔر کو یہ گوارا بھی نہیں۔اس لیے میؔر اس تضاد کی نفی نہیں کرتے بلکہ اس کا اقرار نہایت عمدہ پیرایہ میں یوں بیان کرتے ہیں:

کفر کچھ چاہیے اسلام کی رونق کے لیے
حسن زنّار ہے تسبیح سلیمانی کا(۱۰)

میؔر کا واعظ پر طنز بھی اس لیے ہے کہ وہ شبانہ روز عبادت سے فرشتہ بن گیا ہے لیکن انسان نہیں بن سکا۔

ہم نے یہ مانا کہ واعظ ہے ملک
آدمی ہونا بہت مشکل ہے یاں(۱۱)

میرؔ انسان کے اس داخلی تضاد کو تسلیم کرتے ہوئے انسان کی عظمت کے ترانے گاتے ہیں۔ اُن کے نزدیک حضرتِ انسان کو جو تقدس اُس ذاتِ قدوس سے ملا ہے وہ ملک کو ملکیت کے باوجود نہیں مل سکا۔ بلکہ روح القدس انسان کا ایک ادنیٰ دربان ہے۔ یہ کائنات انسان سے پہلے ایک ایسا آئینہ تھا جو قابلِ دیدار نہ تھا لہٰذا انسان مقصودِ کائنات ہے۔انسان کائنات میں سب سے زیادہ ذمہ دار مخلوق ہے اور اُس کے کاندھوں پر ایسا بوجھ لادا گیا جو دیگر موجودات کے بس کی بات نہیں۔

یہ مشتِ خاک یعنی انسان ہی ہے روکش
ورنہ اُٹھائی کن نے اِس آسماں کی ٹکر (۱۲)

یہی احساسِ ذمہ داری ہے جس سے میرؔ ناکامیوں سے کام لینے کا ہنر جانتے ہیں بلکہ زندگی کا قرینہ بھی یہی ہے کہ نامردانہ زیست کی جائے۔لیکن میرؔ کا انسان زندگی میں جس چیز کو سب سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ غم اور غم اُٹھانے کا حوصلہ ہے۔میرؔ کا انسان غم کو زندگی کی مستقل قدر کا خیال کرتا ہے اور اس مستقل اور عظیم قدر کی پہچان اُس جذبہ سے ہوتی ہے جسے عشق کہتے ہیں۔ یہ عشق ہی ہے جس نے اس کائنات کو منور کیا ہے۔ عشق نہ ہوتا تو کائنات کا ظہور بھی نہیں ہوتا تھا۔اس عشق کی ہمہ گیری اور وسعت کا اندازہ میرؔ کی غزلیات کے ساتھ ساتھ مثنویات سے ہوتا ہے۔شبیہہ الحسن نونہروی کا یہ بیان کچھ ایسا مبالغہ بھی نہیں کہ :

''میرؔ کے عشق میں جو شدت اور ہمہ گیری ملتی ہے وہ اردو زبان کے کسی دوسرے شاعر کے حصہ میں نہیں آئی۔''(۱۳)

میرؔ کی شاعری میں انسان اپنی تمام تر آلائشوں کے باوجود کائنات میں ارفع مقام کا حامل ہے اور اس کا جذبہ عشق اُس میں ایسا حوصلہ پیدا کرتا ہے جو اسے اس قابل بناتا ہے کہ زندگی کے مسلسل دکھوں کا مقابلہ جرأت سے کرے۔ وہ زندگی کے کسی مرحلے پر بھی مایوس نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنی ناکامیوں سے کام لیتا ہے اور نامرادانہ زیست کرنے کو اپنا طور بنالیتا ہے۔

قائمؔ چاندپوری کے ہاں انسان کے بارے میں نہایت بصیرت افروز خیالات ملتے ہیں جو محض مروّجہ مذہبی رجحانات یا صوفیانہ تفلسف سے ماخوذ نہیں بلکہ قائمؔ کی ذاتی فکری اپج اور شاعرانہ تخیل کا نتیجہ بھی ہیں۔

قائمؔ کے نزدیک انسان کی فطرت میں نیکی اور بدی دونوں رجحانات موجود ہیں اور وہ اپنی فطرت سے گریز نہیں کرسکتا۔ گناہ اُس سے سرزد ضرور ہوتا ہے۔کوئی بھی انسان ظاہری طور پر کتنا ہی اپنے آپ کو متقی و پرہیزگار ظاہر کرے اُس کے باطن میں گناہ کا میلان ضرور پایا جاتا ہے۔

کون سا اہلِ صفا آلودگی سے پاک ہے
آبِ آئینہ بھی جو ہر سے پراز خاشاک ہے (۱۴)

لیکن ایک گناہ گار انسان مردود نہیں ہے۔ وہ بھی کائنات کی ضرورت ہے۔ بُرا انسان بھی کارخانہء حیات کا ایک پرزہ ہے۔ جس طرح انسان کے جسم کے اعضا جسم کے ساتھ ناگزیر ہیں۔ چاہے وہ اعضا پاک ہیں یا آلودگی سے پُر ہیں لیکن انہیں جسم سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

ہر بدو نیک جہاں اپنی جگہ ہے مطلوب
کون سا عضو بدن میں ہے کہ درکار نہیں (۱۵)

قائم انسان کو اُس کی برائی اور آلودگی کے باوجود اُسے کائنات میں ایک لطیف مخلوق خیال کرتے ہیں۔ انسان اپنی ذات سے حظ اُٹھاتا ہے اور اپنی موجودگی سے لطف لیتا رہتا ہے۔ قائم خدا سے مخاطب ہے:

الٰہی! واقعی اتنا ہی بد ہے فسق و فجور
ہر اُس مزہ کو سمجھتا جو تو بشر ہوتا (۱۶)

لیکن قائم بعض اوقات حیاتِ انسانی کے اس لطف سے یاس میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے۔ جب وہ یہ خیال کرتا ہے کہ انسان کی زندگی فانی ہے اور یہ خراباتِ جہاں ایک دن خراب ہو جائے گا۔ قائم نے اس مضمون کو نہایت عمدگی سے باندھا ہے۔

بِنا تھی عیشِ جہاں کی تمام غفلت پر
کھلی جو آنکھ تو گویا کہ اِحتلام ہوا (۱۷)

اردو کی کلاسیکی شاعری میں فنا کا تصور کئی ایک زاویوں سے دیکھا جاسکتا ہے۔ مذہبی فکر کے زیر اثر حیاتِ نو پانے کی رجائیت اپنی جگہ موت کے ذریعے پیکرِ خاکی کے خاتمے کا خیال حزن و ملال کا باعث بھی رہا ہے۔ قائم چاند پوری نے انسانی فنا کے تصور کو تصورِ تقدیر سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا ہے۔ اگرچہ شعر کا مضمون تقدیر کے جبر کو واضح کرتا ہے لیکن اسلوب کے اعتبار سے دیکھیں تو شعر میں پیش کیا گیا خیال کئی ایک نئی جہتیں رکھتا ہے۔

چرخِ مینائی سے کیا مر کے کوئی چھوٹے گا
مے ہے اس شیشے میں تا شیشہ نہ یہ پھوٹے گا (۱۸)

ڈاکٹر وزیر آغا نے درد کی شاعری کے بارے میں لکھا ہے:

''درد کی شاعری کو تصوف اور جذب کی شاعری کہا گیا ہے۔ حالانکہ درد کے ہاں تفکر، تعقل اور تشکیک

کا وہ میلان زیادہ قوی تھا جو فرد کو ایک صاحبِ بصیرت تماشائی کا منصب بخشتا ہے۔''(۱۹)

اس بحث سے قطعِ نظر کہ دردؔ کی شاعری تصوف کی شاعری ہے یا تعقل کی۔ یہ بات طے ہے کہ دردؔ ایک صاحب حال صوفی تھے اور انہوں نے کائنات اور اس موجودات کو ایک صوفی ہی کی نگاہ سے دیکھا۔ چنانچہ اُن کی شاعری میں کائنات کے صوفیانہ مشاہدے اور بعض اوقات اس کے نتائج بھی ملتے ہیں۔ سیّد عبداللہ اپنے ایک مضمون میں دردؔ کی شاعری کا فنی نقطہءِ نظر سے جائزہ لیتے ہوئے ایک منفرد پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے کہ:

''دردؔ کے کلام میں ایسے اشعار کی تعداد خاصی ہے جن میں الفاظ ''دید''، ''سیر'' اور ''دیکھنا'' استعمال ہوئے ہیں۔۔۔اُن کی لفظیات میں ''دید''، ''سیر'' کا عنصر خاصا ہے جس سے اُن کی ذہنی رغبتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔''(۲۰)

دردؔ کے ہاں مذکورہ لفظیات دراصل صوفیا کے اس عقیدے کے زیرِ اثر نہیں کہ مطالعہ کائنات کا اصل قرینہ مشاہدۂ کائنات ہے۔ انسان اپنی بصارت اور اُس کے توسط سے دیگر حواس کو متحرک کر کے زمان و مکان کا شعور حاصل کر سکتا ہے اور بہت سے اسرار کے ادراک کے لیے آگہی کا رستہ کھولنے کے قابل ہو سکتا ہے۔ اگرچہ درد کائنات کے اسرار پر منفرد یا نئی فکری جہتوں سے غور نہیں کرتے اور وہ وحدت الوجودی نقطۂ نظر اختیار کرتے ہوئے، عناصرِ کائنات میں خالقِ کائنات کا جلوہ دیکھتے ہیں تاہم اُن کے شعروں میں دعوتِ مشاہدہ آگہی کے وسیلے کا درجہ ضرور رکھتی ہے:

جگ میں آ کر ادھر اُدھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا(۲۱)

تجھی کو جو یاں جلوہ فرمانہ دیکھا
برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا(۲۲)

ان اشعار کی روشنی میں دیکھیں تو دردؔ کا انسان ایک صاحبِ نظر انسان ہے جو کائنات کو دیکھتا ہے۔ غور کرتا ہے اور اپنے مشاہدہ اور تفکر ہی سے کائنات اور انسان کے بارے میں اپنا ایک نقطۂ نظر اپناتا ہے۔

جلوہ تو ہر اک طرح کا ہر شان میں دیکھا
جو کچھ کہ سنا تجھ میں سو انسان میں دیکھا(۲۳)

بیگانہ گر نظر پڑے تو آشنا کو دیکھ
بندہ گر آوے سامنے تو بھی خدا کو دیکھ(۲۴)

دردؔ کا یہ شعر ایک عجیب سوال کو جنم دیتا ہے۔ کیا پیکرِ خا کی وجود بیگانہ ہے؟ غالباً درد کا استفہام سوال نہیں بلکہ انسان کو دعوتِ فکر ہے کہ وہ سوچے کب اُس کا پیکر بیگانگی کا روپ اختیار کرتا ہے اور کب رنگِ آشنائی، درد کے نزدیک انسان خدا سے آگاہ تب ہوتا ہے جب وہ اپنے مقصدِ حیات سے ہم آہنگ ہوتا ہے اور وہ اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ انسان اپنے دل میں دوسرے انسانوں کے لیے جذبہ محبت بیدار کرے۔ وہ بندۂ خدا ضرور بنے لیکن بندگانِ خدا اور اُن کے مسائل سے خود کو بیگانہ نہ کرے خدا کو اُس کے رکوع و سجود سے زیادہ اُس کا وہ قیام مطلوب ہے جو مخلوقِ خدا کے درد و آلام کے خاتمے کا باعث ہو سکے اور یہی وہ صفت ہے جو اُسے فرشتوں سے برتر قرار دیتی ہے۔

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں (۲۵)

غالبؔ کی شاعری میں ہم جس انسان سے متعارف ہوتے ہیں وہ ایک ایسا انا پرست انسان ہے جسے پوری کائنات ایک بازیچۂ اطفال سے کچھ زیادہ نظر نہیں آتی اور یہ انسان وبائے عام میں مرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ غالب کی انائیت کے پس منظر میں کئی عوامل کرفرما ہیں۔ تصوف کی طرف میلان، خاندانی تفاخر، احساسِ محرومی اور انقلاب ۱۸۵۷ء اور اُس عہد کے دگرگوں حالات ۔ یہ سب عناصر غالبؔ کو ایک انا پرست بلکہ سراپا انا بنا دیتے ہیں۔

غالبؔ کی انا کو سلیم احمد نے اُس وقت کے حالات کے تناظر میں دیکھا ہے۔ اُن کے خیال میں غالبؔ کی فرد پرستی دراصل ہندوستان میں انگریز کی آمد، سیاسی و سماجی سطح پر دگرگوں حالات اور شکست و ریخت کا نتیجہ ہے۔ تاہم سلیم احمد کو غالبؔ کی انا پرست ذہنیت قطعاً ناپسند ہے۔ اُن کے نزدیک یہ انائیت منفی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''غالب کی شاعری میں منفی اثرات اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے زمانے کا سب سے سچا گواہ تھا۔ یہ جو وہ عشق اور عشق کی قدروں کا مزاق اُڑاتا ہے، یہ جو وہ حسن پر نکتہ چینی کرتا ہے اور حریم ناز میں بھی خود نمائی سے باز نہیں رہتا، یہ جو وہ نہ صرف محبوب کو بلکہ اپنے آپ کو بھی خدا کو سونپنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ یہ سب باتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ غالب نے اپنے زمانہ کی حقیقی روح کو سمیٹ لیا تھا۔''(۲۶)

سلیم احمد کا یہ خیال کہ غالبؔ کی انا اور تفاخر اپنے عہد کی شکست و ریخت کا نتیجہ ہے۔ اپنے اندر بہت حد تک صداقت رکھتا ہے۔ غالبؔ کے لیے ''طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا'' میں بھی زہر ملا ہے۔ وہ آئنہ سے ڈرتا ہے کیونکہ کتوں کی طرح انسانوں نے بھی اُسے آزار پہنچایا ہے۔۔۔۔ غالبؔ ہر انسانی رشتے سے بیزار ہے۔ یہ بیزاری کبھی مخاطب کا طنز بن جاتی ہے کبھی شکایت، کبھی ایک فغاں کی سی کیفیت

،کبھی ایک کرب کی چیخ کی،کبھی وہ زہریلی آواز جوبعض اوقات غیرانسانی معلوم ہوتی ہے۔کہیں کہیں اُسکی خودرحمی مریضانہ حدتک پہنچ جاتی ہےاورساتھ ہی کابوس نماانانیت زدگی بھی جوبعض اوقات اُسے انسانوں سےاتنی دورلے جاتی ہے کہ وہ جناتوں کی زباں بولنےلگتا ہے۔''

غالب کے بارے میں یہ حقائق پڑھتے ہوئے یہ امر بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ سلیم احمد جس غالب کے بارے میں اظہارِ خیال کر رہے ہیں وہ محض ایک شاعر نہیں بلکہ عہدِنو اوراُس کی نفسیات کا استعارہ ہے۔عہدِ نو میں جس نوعیت کی تنہائی پسندی ، انسانی بیزاری اور وجودی کرب نظر آ تا ہے اُس کا پہلا اظہار غالب کی غزل ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیراہن ہر پیکرِ تصویر کا(۲۷)

غالبؔ کےنزدیک کائنات محض ایک فریبِ ہستی ہےاور''عالم تمام حلقہ دام خیال ہے۔''اس کائنات میں انسان کی حیثیت اُس مرغِ اسیر کی سی ہے جوقفس میں اپنا آشیانہ تعمیر کرنے کے لیےخس فراہم کرتا رہتا ہے۔انسان کی ہستی فنا کی دلیل ہےاوراُس کا وجودخارِ بیاباں پرقطرۂ شبنم کی طرح ہے۔ یہ تصورات غالب کووجودیت پسند بنادیتے ہیں اوروہ ایک عمیق بحرِغم میں غرق ہوجاتے ہیں:

نَے گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز(۲۸)

بےدلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں(۲۹)

لیکن غالبؔ کا جذبہ تحرک اُن کی اس قنوطی کیفیت میں تسلسل نہیں آنے دیتا۔وہ نہ صرف آلام زمانہ کوسہارنے کا سلیقہ رکھتے ہیں بلکہ ہمت بھی، غالبؔ سمجھتے ہیں کہ روئے دریا آگ ہے جبکہ قعرِ دریا سلسبیل ہے ۔اس لیے وہ خوفِ بلا رکھنے کے بجائے بلا کا سامنا کرنے کو بہتر خیال کرتے ہیں۔ وہ طوفانِ حوادث کواپنے لیےمکتب خیال کرتے ہیں۔جن میں رہ کر وہ زندگی کرنے کا ڈھنگ سیکھتے ہیں۔ چنانچہ غالبؔ انتہائی یاسیت کے عالم میں بھی رجائیت کی جانب لوٹ آتے ہیں۔

غالبؔ مکمل طور پر رجائی شاعر نہ سہی لیکن انسان کو زندگی کرنے کا سلیقہ ضرور بتاتے ہیں ۔ غالبؔ کے ہاں جہاں زندگی کا کرب نظر آتا ہے وہاں عالی ہمت اور بلند حوصلہ بھی ملتا ہےاور یہ بلند حوصلہ غالبؔ کواس کی انا کی دین ہے جواُسکے وجود کی شکست وریخت برداشت نہیں کرسکتی ۔ بلکہ ایک ایسےاعتماداوروسعتِ نظر سے آشنا کرتی ہے کہ صحرا گرد میں نہاں نظر آتا ہےاوردریا اپنی جبیں خاک پر

گھستا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں وہ قطرہ ہے کہ گوہر نہ ہوا تھا(۳۰)

کلاسیکی اردو غزل میں تصورِ انسان کے سلسلے میں ذوق کی انفرادیت اخلاقی مضامین پر مشتمل اشعار ہیں۔ اُن کے ہاں وجودِ انسان کے بارے میں فکری مسائل بھی ہیں مگر اس سے کہیں زیادہ اخلاقیات پر مشتمل مضامین ہیں۔ وہ انسانی اوصاف کو ایک جوہری کی طرح پرکھتے ہیں:

گہر کو جوہری، صرّاف زر کو دیکھتے ہیں
بشر کے ہیں جو مبصر، بشر کو دیکھتے ہیں(۳۱)

کلامِ ذوقؔ میں انسان کی ذات اور اُس کی مختلف جہات پر تبصرہ کئی مقامات پر کیا گیا ہے۔ ذوقؔ کے کلام میں ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں اخلاقی سبق دیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے ذوق کی شاعری کا انسان ایک ''اخلاقی انسان'' ہے۔ درد کی طرح ذوقؔ کے نزدیک بھی انسان کے وجود کو درد سے معمور کر دیا گیا ہے اور وہ سراپا سوز اور سراپا درد ہے۔

بنایا اس لیے اس خاک کے پتلے کو تھا انساں
کہ اس کو درد کا پتلا بنائیں سر سے پاؤں تک(۳۲)

کائنات میں انسان محبت کا مظہر ہے اور انسان کی مشتِ خاک ہی نے کائنات میں عشق کو فروغ دیا۔ اور موجودات کو قیمتِ عشق سے آگاہ کیا۔

جب بنی تیرِ حوادث کی کماں افلاک سے
عشق کا تودہ بنا انساں کی مشتِ خاک سے(۳۳)

خدا نے انسان کو کائنات میں ایک مرکز کی حیثیت دی ہے۔ اور اس کے لیے کائنات کو سجا دیا گیا۔

جو کچھ کہ ہے دنیا میں وہ انساں کے لیے ہے
آراستہ یہ گھر اسی مہماں کے لیے ہے(۳۴)

لیکن اس مہمان کو کائنات میں محض لذتِ کام و دہن کے لیے نہیں لایا گیا اور نہ ہی زندگی کی آسائشوں سے محض لطف اندوز ہونے کے لیے بلکہ اس پر ایک بھاری ذمہ داری بھی خدا نے عائد کی جو اُسے عرصۂ زیست میں اُٹھانی ہے۔

بنایا آدمی کو ذوقؔ ایک جزوِ ضعیف
اور اس ضعیف سے کل کام دو جہاں کے لیے(۳۵)

انسان ایک ناتواں ذات ضرور ہے لیکن وہ اُس ذمہ داری اور فرض کو نبھانے کا اہل ہے جو اُسے خدا کی طرف سے سونپا گیا ہے۔ مگر انسان کائنات کی آسائشوں میں محو ہوگیا ہے۔ اُس کی خواہشوں اور نفس کی آلائشوں نے اُسے غافل کر دیا ہے اور عشق کی بھاری ذمہ داری جو اُسے سونپی گئی بلکہ خود اُس نے قبول کی۔ اُس کی تکمیل میں کوتاہی کر رہا ہے۔ ذوقؔ کہتے ہیں:

ہے موجِ بحرِ عشق وہ طوفاں کہ الحفیظ
بے چارہ مشتِ خاک تھا انسان بہہ گیا(۳۶)

اور انسان جو رنجِ ہستی کا چارہ گر بھی ہے۔ اپنے نفس کی وجہ سے خود بے چارہ ہوگیا۔ نفس کے بارے میں ذوقؔ کہتے ہیں:

گرچہ ہے استادِ شیطاں، نفس شاگردِ رشید
پر یہ شاگرد رشید استاد ہے استاد کا(۳۷)

ذوقؔ کی لفظیات میں 'نفس' بنیادی طور پر اہمیت کا حامل ہے۔ اُن کے نزدیک یہ نفس ہی ہے جو ''احسن التقویم'' کو ''اسفل سافلین'' بنا دیتا ہے۔

جس انساں کو سگِ دنیا نہ پایا
فرشتہ اُس کا ہم پایہ نہ پایا(۳۸)

بڑے موذی کو مارا نفسِ امارہ کو گر مارا
نہنگ و اژدہا و شیرِ نر مارا تو کیا مارا(۳۹)

چنانچہ ذوقؔ تربیتِ نفس پر زور دیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک محض علم حاصل کر لینے سے انسان اعلیٰ نہیں ہو جاتا بلکہ اپنی ذات کی تربیت سے انسان اپنی حقیقت کا عرفان حاصل کر لیتا ہے۔ ذوقؔ علم اور عشق میں ایک امتیاز برتتے ہیں:

آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور چیز
کتنا طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا(۴۰)

علم جس کا عشق اور جس کا عمل وحشت نہیں
وہ فلاطوں ہے تو اپنے قابلِ صحبت نہیں(۴۱)

ذوقؔ کے نزدیک انسان کو صاحبِ دل ہونا چاہیے۔ اُس کا وجود عشق کے نور سے معمور ہو۔ جس طرح ایک پروانہ شمع پر نثار ہو جاتا ہے۔ انسان کو بھی اپنا پیکرِ خاکی شعلۂ عشق میں جلا دینا چاہیے۔

انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے محبوب حقیقی کے دل میں گھر کرے۔

گر پڑے ہے آگ میں پروانہ سا کرمِ ضعیف
آدمی سے کیا نہ ہو لیکن محبت ہو تو ہو (۴۲)

مومن اپنے بیشتر شعری سفر میں طوافِ کوئے بتاں ہی میں مشغول نظر آتے ہیں اور اس عبادت میں اس قدر مستغرق رہتے ہیں کہ کوچۂ محبوب سے باہر کی دنیا میں جھانکنے کو بھی گمراہی خیال کرتے ہیں۔ یہ استغراق انہیں حیات و کائنات کے مسائل کا سامنا نہیں کرنے دیتا۔ اس لیے اُن کے ہاں تصورِ انسان کی کوئی قابل ذکر بحث نہیں ملتی۔ انسان کے حوالے سے اُن کے دیوان میں اشعار کی تعداد نہایت قلیل ہے اور ان اشعار میں بھی انسان کا تصور اُن کے عشقِ مجازی کے محدود تصور ہی میں محصور نظر آتا ہے۔

جنونِ عشق ازل کیوں نہ خاک اُڑائیں ہم
جہاں میں آئے ہیں ویرانیِ جہاں کے لیے (۴۳)

انسان کے بارے میں مومن کا تصور رجائی نہیں بلکہ قنوطی ہے۔ انسان نہ صرف مجبورِ محض ہے بلکہ اس حصار میں بھی اس کا وجود آگ کی طرح جل رہا ہے۔

سب گرمیِ نفس کی ہیں اعضا گدازیاں
دیکھو نہ زندگی، ہے سراپا زیانِ شمع (۴۴)

کلامِ آتش میں انسان ایک مردِ فقیر کی صورت میں نظر آتا ہے۔ جو نہ صرف اپنے حال میں مست ہے۔ بلکہ حیات و کائنات کو بھی وہ اسی مستی کے عالم میں دیکھتا ہے۔ آتش کی لفظیات میں مست، دیوانہ، قناعت، توکل پن، قبا اور خلوت ایسے لفظ کثرت میں ملتے ہیں۔ اس مردِ آزاد کو مال و منال کی کوئی پروا نہیں ہے۔ نہ اس کے پاس طبل و علم ہے نہ ملک و مال بلکہ میسر و موجود پر توکل کرنے والا ہے اور نہایت بے طمع انسان ہے۔ آتش کی غزل میں نظر آنے والا یہ قانع انسان دراصل آتش کی اپنی شخصیت ہے جو دولتِ فقر سے مالا مال ہے۔ مگر دولتِ دنیا سے غنی اور بے نیاز

دولتِ دنیا سے مستغنی طبیعت ہو گئی
خاکساری نے اثر پیدا کیا اکسیر کا (۴۵)

آتش کے نزدیک توکل آدمی کے واسطے موکل ہے۔ خدا کی ذات پر قناعت کرنے والے کو روزی خود بخود مل جاتی ہے۔ اس لیے مردوں کی یہ علامت ہے کہ وہ زر و مال کے پیچھے بھاگتے نہیں ہیں۔

دنیا کو تھوکتے نہیں مردانِ راہ عشق
نامرد رکھیں آنکھوں پہ اس پیرزن کے پاؤں (۴۶)

کلامِ آتش میں اخلاقیات کا نظام اسی تصورِ انسان کے حوالہ سے تشکیل پاتا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی ،آخرت، عذابِ مرقد اور جسم و جاں کے مسائل کے پس منظر میں آتش اسی انسان کی آرزو کرتے ہیں۔

آتش نے اپنی شاعری میں اخلاقی مضامین کے علاوہ عظمتِ انسانی کا بھی بیان کیا ہے اور اس طرح انسان کو اس کے اصل مقام سے آگاہ کرنے کے لیے کوشش کی ہے۔ اِن استعاروں میں تفاخر اور ذمہ داری کے احساسات ایک ساتھ ملتے ہیں۔ انسان کا وجود بظاہر دیگر موجودات کی طرح مختلف عناصر سے بنا ہے اور دوسرے حیوانات کی طرح یہ بھی گوشت پوست رکھتا ہے۔

لیکن دوسرے حیوانات سے جو چیز انسان کو مشرف قرار دیتی ہے وہ اُس کا فکر و شعور ہے جس کی مدد سے اُس نے کائنات کو تسخیر کر لیا ہے اور اگر انسان اپنی عقل سے کچھ کام نہیں لیتا تو وہ دیگر بھی حیوانوں کی طرح ہے۔

خوف نافہمی مردم سے مجھے آتا ہے
گاوخر ہونے لگے صورتِ انساں پیدا(۴۷)

اردو کی کلاسیکی غزل میں جہاں زندگی کی ماہیت کے بارے شعرا کی فکر کے مختلف زاویے ملتے ہیں وہاں حقیقتِ انسان کے حوالے سے بھی اُن کے نقطۂ نظر کی عکاسی ہوتی ہے۔ ان شعرا کا تعلق چونکہ ایک روایتی اور مذہبی ماحول سے تھا اور فکری اعتبار سے صوفیانہ خیالات کی طرف ان کا میلان زیادہ تھا لہٰذا انسان کے بارے میں بھی ان کا تصور مذہب اور صوفیانہ فکر سے الگ کر کے دیکھا نہیں جا سکتا۔

خدا اور انسان کے مابین کیا تعلق ہے؟ انسان کی فطرت میں ثواب و گناہ کے میلانات کیا ہیں؟ وہ ایک مقتدر ہستی ہے یا مجبورِ محض؟ انسان فکری یا روحانی اعتبار سے کس طرح ترقّی حاصل کرتا ہے اور کون سے رجحانات اُسے پستی کی طرف کھینچتے ہیں؟ کائنات میں انسان کا کیا جواز ہے اور وہ دیگر مخلوقات سے کس طرح مختلف ہے؟ یہ اور ان ایسے دیگر سوالات کلاسیکی اردو غزل کے بنیادی سوال رہے ہیں اور شعرا نے اپنے ماحول کی فکری حدود میں رہتے ہوئے اِن کے جوابات تلاش کیے۔ اگرچہ یہ شعرا مذہبی یا صوفیانہ خیالات ہی کے مویّد رہے تاہم اظہار کے قرینوں نے اِن کی فکر کو رنگ انفرادیت ضرور عطا کیا ہے۔ خصوصاً بعض استعارات و تشبیہات سے روایتی فکر میں بھی اسلوبِ جدید کا ذائقہ واضح محسوس کیا جا سکتا ہے۔

❑❑❑

حوالہ جات وحواشی

۱۔ جیلانی کامران، ''نئی نظم کے تقاضے'' لاہور، کتابیات، ۱۹۶۷ء، ص ۴۰۳

۲۔ ڈاکٹر تحسین فراقی، ''حیاتِ اقبال'' لاہور، بزمِ اقبال ۱۹۹۳ء، ص ٦

۳۔ ولی دکنی، ''دیوانِ ولی'' (مرتبہ، نورالحسن ہاشمی) ص ۳۷

۴۔ ایضاً، ص ٦۷

۵۔ ایضاً، ص ۸۵

٦۔ ایضاً، ص ٦۸

۷۔ ایضاً، ص ٦۷

۸۔ محمد حسن عسکری، ''مجموعہ حسن عسکری'' لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز ۱۹۹۴ء، ص ۱٦۱

۹۔ سلیم احمد، مضمون ''چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے''، نیا دور شمارہ ٦۴۔ ٦۳، ص ۴۸۔ ۴۷

۱۰۔ میر تقی میر، ''کلیاتِ میر'' (مرتبہ: عبدالباری آسی) لکھنؤ، نولکھنؤ پریس ۱۹۵۱ء (گیارھواں ایڈیشن) ص ۳

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۰٦

۱۲۔ ایضاً، ص ۴۷

۱۳۔ شبیہہ الحسن نونہروی، مضمون ''مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں''، نقوش (میر نمبر) ص ۳۲۹

۱۴۔ قائم چاند پوری، ''کلیاتِ قائم'' (مرتبہ: ڈاکٹر خورشید السلام) دلی، مکتبہ جامعہ ۱۹٦۳ء، ص ۲۰۳

۱۵۔ ایضاً، ص ۹۷

۱٦۔ ایضاً، ص ۲۲

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۰۳

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۰

۱۹۔ ڈاکٹر وزیر آغا، مضمون ''غالب کے بارے میں سلیم احمد کا مؤقف'' روایت شمارہ ۴، ص ۱۷۴

۲۰۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، مضمون '' درد کی شاعری کا صوفیانہ لب ولہجہ''، خواجہ میر درد (تحقیقی وتنقیدی مطالعہ) مرتبہ: ثاقب صدیقی، انیس احمد، دلی، ایس اے پبلی کیشنز ۱۹۹۳ء، ص ۲۳۸۔ ۲۳۷

۲۱۔ خواجہ میر درد، ''دیوانِ درد'' (مرتبہ: خلیل الرحمٰن داؤدی) لاہور، مجلس ترقی ادب ۱۹۸۸ء (دوسرا ایڈیشن)

ص۱۱۹

۲۲۔ ایضاً،ص۱۳۰

۲۳۔ ایضاً،ص۱۴۲

۲۴۔ ایضاً،ص۱۹۲

۲۵۔ ایضاً،ص۱۷۷

۲۶۔ سلیم احمد،''ادھوری جدیدیت'' کراچی،سفینہ اکیڈمی،۱۹۷۷ء،ص۷۰

۲۷۔ اسداللہ خاں غالب،''دیوانِ غالب'' دلی،غالب انسٹی ٹیوٹ،۱۹۸۶ء،ص۱۱

۲۸۔ ایضاً،ص۶۱

۲۹۔ ایضاً،ص۱۸۶

۳۰۔ ایضاً،ص۳۸

۳۱۔ ابراہیم ذوق''کلیاتِ ذوق'' (جلد اول) (مرتبہ: ڈاکٹر تنویر احمد علوی) لاہور،مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۸ء (دوسرا ایڈیشن) ص۲۵۶

۳۲۔ ایضاً،ص۳۰۶

۳۳۔ ایضاً،ص۳۰۶

۳۴۔ ایضاً،ص۳۵۶

۳۵۔ ایضاً،ص۳۱۲

۳۶۔ ایضاً،ص۱۶۵

۳۷۔ ایضاً،ص۱۶۸

۳۸۔ ایضاً،ص۱۶۹

۳۹۔ ایضاً،ص۱۸۳

۴۰۔ ایضاً،ص۱۶۳

اقبال کا شعر ہے:

زندگی کچھ اور شے ہے،علم ہے کچھ اور شے
زندگی سوزِ جگر ہے، علم ہے سوزِ دماغ

شعر کا مصرعہ اول،ذوق کے مذکورہ شعر کے تناظر میں توارد کی ایک مثال ہے۔

۴۱۔ ایضاً،ص۲۵۲

۴۲۔ ایضاً،ص۲۸۳

۴۳۔ مومن خاں مومن،''دیوانِ مومن''(مرتبہ:ضیااحمد ضیا)،دلی شانتی پریس،۱۹۶۲ء(چوتھاایڈیشن)ص۲۵۷

۴۴۔ ایضاً،ص۱۰۲

۴۵۔ حیدر علی آتش،''کلیاتِ آتش''لاہور،اردو مرکز،۱۹۶۳ء،ص۱۷۳

۴۶۔ ایضاً،ص۲۳۵

۴۷۔ ایضاً،ص۹۹

❑❑❑

فیض احمد فیضؔ اور فارسی شعرا

—سیّد وقار حیدر—

فیض احمد فیضؔ کا شمار اگرچہ جدید شعرا میں ہوتا ہے لیکن مزاجاً وہ شعرا کی کلاسیکی روایات کی ہی پیروی کرتے نظر آتے ہیں چاہے وہ اُردو ہو یا فارسی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری کا تنا آور درخت زمین کے اوپر تو بظاہر جدید اُردو شاعری کے اوصاف رکھتا ہے لیکن اِس کی جڑیں اُس زبان یعنی فارسی سے جاملتی ہیں جن سے کبھی اُردو زبان نے بھی بھرپور استفادہ کیا تھا۔

اگر اُردو شعرا میں خسروؔ، سوداؔ، دردؔ، غالبؔ، حسرتؔ اور اقبالؔ کو پسند کرتے ہیں تو اِن کے کلام میں موجود کلاسیکی فارسی شعرا کے اشعار کی موجودگی اُن کی فارسی شعرا سے عقیدت کو ظاہر کرتی ہے۔ اگر وہ اردو شعرا کی نذر نظمیں کرتے ہیں تو ان کے کلام میں ہمیں فارسی شعرا کی نذر کی گئی نظمیں بھی مل جاتی ہیں اگر وہ اردو شعرا کی بحروں اور زمینوں میں غزلیں کہتے ہیں تو فارسی شعرا کی بحروں اور زمینوں کا استعمال بھی ہمیں ان کے کلام میں نظر آتا ہے الغرض فیضؔ نے جتنا استفادہ اردو کلاسیکی روایات سے کیا اتنا ہی وہ فارسی کلاسیکی روایات سے بھی استفادہ کرتے نظر آتے ہیں۔

فیضؔ نے گو بہت سی شہرۂ آفاق حاصل کرنے والی نظمیں لکھیں لیکن یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ بنیادی طور پر غزل کے ہی شاعر تھے۔ جس کا ثبوت ان کی نظموں سے ملتا ہے کیونکہ جب وہ مصرعہ تراشتے ہیں تو اس کا انداز وہی غزل والا ہوتا ہے۔

> ''فیضؔ کا بڑا کارنامہ دراصل یہ ہے کہ انھوں نے کلاسیکی اصطلاحاتی الفاظ کو دوبارہ زندہ اور انھیں غزل میں مقبول کیا ورنہ فیضؔ کے زمانے میں یہ سب خوبصورت الفاظ یا تو تر کھو چکے تھے یا اپنے معنی کھو چکے تھے۔۔۔فیضؔ نے غزل میں کلاسیکی رنگ کو جس طرح زندہ کیا وہ ہماری شاعری کا ایک روشن باب ہے۔ان کی غزل میں۔۔۔وہ تہذیب بول رہی ہے جس میں مضمون آفرینی اور کیفیت کا عمل دخل تھا۔فیضؔ کے یہاں کیفیت کا جادو نظموں میں بڑھ چڑھ کر بولتا ہے۔اس لیے

ضروری ہے کہ غزل کی تہذیب کے پس منظر میں فیضؔ مطالعہ از سرنو کیا جائے۔''(۱)

فیضؔ کی غزل میں اردو روایات کے ساتھ ان فارسی روایات کی پیروی بھی نظر آتی ہے کہ جن کے زیر اثر اردو غزل آج اس مقام تک پہنچی ہے۔ان کی شاعری میں خوبصورت فارسی الفاظ وتراکیب کا استعمال ملتا ہے اوران کو مجموعہ ہائے کلام کے عنوانات زیادہ تر تراکیب پر مشتمل ہیں اور چند ایک تو دوسرے شعرا کے اشعار سے بھی اخذ کیے گئے ہیں مثلاً

''دست تہہ سنگ''اس شعر سے ماخوذ ہے:

مجبوری و دعویٰ گرفتارِ الفت
دستِ تہہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

اور کلیات کا نام ''نسخہ ہائے وفا''غالبؔ کے اس شعر سے لیا گیا ہے:

تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

اسی طرح دیگر مجموعوں کے عنوانات جن میں ''نقش فریادی''،''سروادیِ سینا''،شام شہرِ یاراں'' اور''غبارِ ایّام'' شامل ہیں، بھی فارسی تراکیب ہی ہیں۔فارسی شعرا میں وہ حافظؔ،سعدیؔ،عرفیؔ،نظامیؔ، بیدلؔ اور اردو شعرا کے فارسی کلام جن میں علامہ اقبالؔ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، سے متاثر نظر آتے ہیں۔وہ ان کے اشعار کو اپنے کلام کا حصہ بناتے ہیں۔ان کے اشعار سے نئے نئے مطالب اخذ کرتے ہیں جو شاید ان شعرا نے بھی نہ لیے ہوں۔وہ ان کے کلام کو اپنی تحریروں اور تقریروں کا بھی حصہ بناتے ہیں۔ان شعرا اور ان کے اشعار کا جائزہ جنھیں فیضؔ نے اپنے کلام میں استعمال کیا اور ان نظموں کا جائزہ جو فیضؔ نے ان کی نذر کیں ہیں ذیل میں لیا جارہا ہے:

حافظؔ شیرازی:(۷۲۶ھ-۷۹۲ھ)

''لسان الغیب''،حافظؔ شیرازی جن کا پورا نام خواجہ شمس الدین محمد حافظؔ شیرازی تھا۔فارسی کے عظیم ترین شعرا میں شمار ہوتے ہیں اور استادانِ شعرا ان کو اپنا استاد تسلیم کرتے ہیں۔''حافظؔ شیرازی نے غزل کو اس مقام تک پہنچایا جس سے نراتر مقام تصور میں نہیں آتا۔آپ کی زبان اس قدر رشتہ ہے کہ آج تک پورے دیوان کا ایک لفظ بھی متروک نہیں مانا گیا۔واقعی ان کی شاعری کو دیکھ کر خداداد نعمتیں دعوت نظارہ دیتی ہیں:

حسد چہ ی بری ای است نظم برحافظ
قبول خاطر و لطف سخن خداداداست (۲)

حافظؔ کے کلام میں حکیمانہ اور عارفانہ نکات، دلنشین شاعرانہ مضامین اور عاشقانہ سچے جذبات کا بیان نہایت ایجاز واختصار کے ساتھ واضح اور خوبصورت انداز میں ملتا ہے اور انہی خوبیوں کی بدولت ہی انھیں ''لسان الغیب''، ''چراغِ اہلِ معنی'' اور ''شمعِ نورِ تجلّی'' جیسے القابات سے نوازا گیا ہے۔ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی اپنی کتاب ''فارسی غزل اور اس کا ارتقاء'' میں حافظؔ شیرازی کے کمالِ فن اور انفرادیت کے ثبوت کے طور پر درج ذیل دو واقعات بیان کرتے ہیں کہ:

''کسی نے کہا تھا کہ سعدیؔ غزل کے پیغمبر ہیں تو حافظؔ کیا ہیں؟ سننے والے نے جواب دیا کہ حافظؔ خدای غزل ہیں۔ سعید انصاری (نشتر ولادت ۱۸۹۴ء) کا ایک شعر ہے:

سہ تن پیامبر مرسل وخدا حافظؔ
بدشت شعر ندامی کینم یا حافظؔ

روایت ہے کہ شاہ عباس صفوی کے دربار میں ایک شاعر زمانی یزدی نے اپنا دیوان پیش کیا کہ حافظؔ شیرازی کے جواب میں لکھا ہے۔ شاہ عباس صفوی نے برجستہ بہ پُر معنی جملہ فرمایا:

جواب خدارا چہ خواہی گفت''(۳)

حافظؔ فارسی شاعری کے علاوہ دیگر کئی علوم میں بھی کمالِ دسترس رکھتے تھے۔ ڈاکٹر علی بیات لکھتے ہیں:

''فارسی زبان وادب سے ان کے شغف کے ثبوت کے طور پر تو ان کی دلفریب اور معجز نما غزلیں ہی کافی ہیں۔ حافظؔ کو نہ صرف مختلف علوم وفنون سے واقفیت حاصل تھی بلکہ وہ ان میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ اسلامی فقہ، عرفان، ہیت، نجوم یا ہندسہ ایسے بہت سے علوم میں حافظؔ تا حد کمال گرفت رکھتے تھے۔''(۴)

ناصحم گفت بجز غم چہ ہنر دارد عشق
بروائے خواجۂ عاقلِ ہنرے بہتر ازیں

یہ شعر کو اس حوالے سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ فیضؔ نے اس شعر کو اپنے مجموعۂ کلام ''مرے دل مرے مسافر'' کے انتساب سے پہلے بھی درج کیا ہے اس شعر میں حافظؔ کہتے ہیں کہ

''مجھے ناصح نے کہا کہ تو عشق کے غم کے سوا کون سا ہنر جانتا ہے۔ اے عقل مند پارسا! اس سے بہتر اور کون سا ہنر ہو سکتا ہے۔''

فیضؔ کی نظم ''نذرِ حافظؔ'' ملاحظہ ہو:

نذرِ حافظؔ

ناصحم گفت بجز غم چہ ہنر دارد عشق — بروائے خواجۂ عاقلِ ہنرے بہتر ازیں
قندِ دہن، کچھ اس سے زیادہ — لطفِ سخن، کچھ اس سے زیادہ

فصلِ خزاں میں لطفِ بہاراں	برگِ سمن ، کچھ اس سے زیادہ
حالِ چمن پر تلخ نوائی	مرغِ چمن ، کچھ اس سے زیادہ
دل شکنی بھی ، دل داری بھی	یادِ وطن ، کچھ اس سے زیادہ
شمعِ بدن ، فانوسِ قبا میں	خوبیٔ تن ، کچھ اس سے زیادہ
عشق میں کیا ہے ، غم کے علاوہ	خواجۂ من ، کچھ اس سے زیادہ

فیض اپنی ایک نظم ''حبیبِ عنبر دست!'' جوانھوں نے اس اجنبی خاتون کے نام لکھی جس نے انھیں خوشبو کا تحفہ دیا تھا۔ اس نظم میں فیض اسے ''حبیبِ عنبر دست!'' کہ کر مخاطب کرتے ہیں اور اپنا پیغام صبا سے کچھ یوں کہلواتے ہیں:

یہ شعرِ حافظِ شیراز ، اے صبا ! کہنا
ملے جو تجھ سے وہ حبیبِ عنبر دست
''خلل پذیر بود ہر بنا کے مے بینی
بجز بنائے محبت کہ خلل از خلل است''

یہ نظم فیض کے مجموعۂ کلام ''زنداں نامہ'' میں شامل ہے۔ جس میں انھوں نے اپنا پیغام ''حبیبِ عنبر دست!'' کے نام حافظ کے شعر کی صورت میں بھیجا ہے۔ جس میں حافظ کہتے ہیں کہ

''میں نے دنیا میں جتنی بھی بنیادیں دیکھیں ہر بنیاد میں کوئی نہ کوئی خرابی پائی مگر عشق ایک ایسی بنیاد ہے جس میں کوئی خرابی نہیں دیکھی۔''

اس شعر کی ایک اور اہمیت یہ بھی ہے کہ فیض نے ماسکو میں ''بین الاقوامی امن انعام'' کے سلسلے میں منعقد ہونے والی تقریب میں اردو میں تقریر کی تھی[۵]، اس تقریر کو ختم کرتے ہوئے فیض نے لبِ لباب کے طور پر جو شعر پڑھا تھا وہ حافظ کا یہی شعر تھا۔

حافظ کا ایک اور شعر فیض کے مجموعۂ کلام ''دستِ صبا'' کی ابتداء میں درج ہے۔ شعر یہ ہے:

نفَسِ بادِ صبا مُشک فشاں خواہد شد
عالم پیر دگر بارہ جواں خواہد شد

اس شعر میں حافظ شیرازی کہتے ہیں کہ:

''صبح کی ٹھنڈی ہوا اس طرح خوشبو بکھیر رہی ہے کہ بڑھاپے کے عالم میں جوانی کی کیفیت محسوس ہونے لگی ہے۔''

حافظ کا یہ شعر نہ صرف مجموعۂ کلام کے نام کی رعایت کی وجہ سے درج کیا گیا ہے بلکہ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ فیض کی یہ کتاب اس وقت شائع ہوئی جب وہ راولپنڈی سازش کیس کے سلسلے میں

اسیر تھے۔حافظؔ کا یہ شعر ان کے ایامِ اسیری میں تازہ ہوا کی تمنا کا اظہار بھی ہے۔

نظامیؔ گنجوی:(۵۳۰ھ-۶۱۴ھ)

نظامیؔ گنجوی جن کا پورا نام حکیم جمال الدین ابو محمد الیاس بن یوسف گنجوی تھا، چھٹی صدی ہجری کے مشہور شاعر تھے۔آپ کو کمالِ فن قدرت کی طرف سے ودیعت کردہ تھا۔طرزِ بیان میں انھیں ہمیشہ ترکیب تازہ کی تلاش رہتی ہے۔ان کی تراکیب میں جدت اور تشبیہ واستعارات میں ندرت پائی جاتی ہے۔نظامیؔ اپنے کلام کی جامعیت کے اعتبار سے بھی فارسی کے منفرد شاعر ہیں۔ان کی شاعری میں رزم بزم، عشق، فلسفہ واخلاق سبھی کچھ ملتا ہے۔''(۶)

''فارسی کے تقریباً ہر بڑے شاعر نے خمسہ کا جواب لکھنے کی کوشش کی ہے چنانچہ جامیؔ، میر علی شیر، امیر خسرو، فیضی وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ نظامیؔ تک کوئی نہ پہنچ سکا۔''(۷)

نظامیؔ گنجوی بھی فیضؔ کے حوالے سے ان شعرا میں شمار ہوتے ہیں جن کا کلام فیضؔ کے مجموعوں میں ملتا ہے۔فیضؔ ان کے شعر کا ایک مصرعہ اپنے مجموعۂ کلام ''نقشِ فریادی'' میں استعمال کرتے ہیں۔مصرعہ یہ ہے:

ع دلے بفروختم جانے خریدم

اس میں نظامیؔ گنجوی کہتے ہیں کہ

''میں نے دل بیچ دیا اور جان خرید لی۔''

عرفیؔ شیرازی:(۹۶۳ھ-۹۹۹ھ ق)

عرفیؔ شیرازی جن کا پورا نام جمال الدین عرفیؔ شیرازی تھا، دسویں صدی ہجری کے مشہور قصیدہ گو شاعر ہیں۔گو انھوں نے مثنویاں بھی کہی تھیں لیکن وہ کم اہمیت کی حامل ہیں۔یہ بات بھی مسلم ہے کہ

''عرفیؔ مثنوی اچھی نہیں کہتا تھا۔۔۔اس سے بھی انکار نہیں کیا ہو سکتا کہ اس کے کلام میں جا بجا خامی پائی جاتی ہے لیکن ان سب باتوں کے ساتھ وہ ایک خاص طرز کا موجد ہے اور آج تک شعرا اس کی تقلید کرتے آ رہے ہیں۔''(۸)

عرفیؔ شیرازی کا ایک شعر فیضؔ کے اوّلین مجموعۂ کلام ''نقش فریادی'' کی ابتداء میں درج ہے۔شعر یہ ہے:

بروائے عقل ومِنہ مَنطِق وحکمت در پیش
کہ مرا نسخۂ غم ہائے فلاں در پیش است

اس میں عرفیؔ کہتے ہیں کہ

''اے عقل! چلے جاؤ اور منطق (توضیح) مت دو اور حکمت اسی میں ہے کہ میرا جو غم کا نسخہ ہے، وہ

فلاں شخص کے لیے ہے۔''

سعدؔی شیرازی: (۶۰۶ھ-۶۹۰ھ)

سعدؔی شیرازی، جن کا پورا نام ابومشرف الدین (شرف الدین) مصلح بن شرف السعدی شیرازی تھا، فارسی غزل کے عظیم ترین شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی ان کے غزل کے پیغمبر ہونے کی دلالت میں یہ رباعی لکھتے ہیں:

''در شعر سہ تن پیمبر انند ہر چند کہ لا نبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را فردوسؔی و انورؔی وسعدؔی''(۹)

سعدؔی بلاشبہ غزل کے امام ہیں اور زمانے نے انھیں استاد تسلیم کیا ہے اور بڑے بڑے شعرا جن میں حافظؔ شیرازی بھی شامل ہیں، نے ان کے تتبع میں غزلیں کہی ہیں۔ اسی وجہ سے فیضؔ بھی ان سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکے، فیضؔ نے باقاعدہ طور پر سعدؔی کا کوئی شعر تو نقل نہیں کیا لیکن ان کے ایک شعر کے مصرعے کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ سعدؔی کا مصرعہ یہ ہے:

ع سنگ ہا را بستند و سگاں را کشادند

جسے فیضؔ نے اس شعر میں ترجمہ کیا ہے:

ہے اہلِ دل کے لیے اب یہ نظم بست و کُشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد

مولانا روم: (۱۲۰۷ء-۱۲۷۳ء)

مولانا جلال الدین رومی، فارسی ادب کے عظیم ترین صوفی شاعر، عالم اسلام کے عظیم ترین مفکر اور صوفی متکلم ہیں اور 'مولانا معنوی'، 'مولوی'، 'ملای رومی'، 'پیر رومی' اور 'پیر روم' کے ناموں سے جانے جاتے ہیں۔ ان کی شخصیت کی ہمہ گیریت کی حامل ہے جس سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں فیضؔ بھی ان سے متاثر نظر آتے ہیں وہ اپنی ایک ''خودنوشت''، ''ہوسٹل کی ایک شام''(۱۰) میں مولانا روم کا ایک شعر نقل کرتے ہیں۔ شعر یہ ہے:

ہر بنائے نو کہ آباداں کنند
اول آں بنیاد او ویراں کنند

جس میں مولانا روم کہتے ہیں کہ ہر وہ نئی بنیاد کہ جسے نئے بنیاد کار رکھتے ہیں سب سے پہلے وہ پہلے ڈالی بنیاد کو ویران کرتے ہیں۔

میرزا بیدلؔ: (۱۶۴۴ء-۱۷۲۰ء)

ابوالمعانی (کنیت) میرزا عبدالقادر بیدلؔ۔ فارسی شاعری کے بلند پایہ اور مسلم الثبوت شاعر اور استاد ہیں۔ تمام تذکرہ نگاروں، نقادوں اور شعرا نے ان کے فن اور شخصیت کی عظمت کو تسلیم کیا ہے اور یہاں تک کہ مرزا غالب اور علامہ اقبال نے بھی انھیں اپنا استاد مانا ہے۔ فن کے لحاظ سے بھی اور معنی ومطالب کے لحاظ سے بھی بیدلؔ تمام فارسی شعرا سے منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔

ایرانی شاعر صائبؔ کا انداز جب اس کے شاگردوں کے ذریعے ہندوستان آیا تو بیدلؔ نے اس کو نہ صرف اپنایا بلکہ ''بیدلؔ کا اسلوب اس سے متاثر ہو کر ترکیب و ترتیب اور خاص ذہن و ذوق کی وجہ سے بالکل نئی ایجاد بن گیا ہے۔''(۱۱)

ان کے اشعار کا ہر ایک لفظ اپنے اندر کئی کئی جہتیں لیے ہوئے ہے۔ فیضؔ نے اپنے مجموعۂ کلام ''غبارِ ایّام'' کے انتساب سے پہلے میرزا بیدلؔ کا ایک شعر نقل کیا ہے شعر یہ ہے:

ہر کجا رفتم غبارِ زندگی در پیش بود
یا رب ایں خاکِ پریشاں از کجا برداشتم

جس میں بیدلؔ کہتے ہیں کہ:

''میں جہاں بھی گیا زندگی کی دھول میرے سامنے رہی، اے خدا! میں یہ بکھری ہوئی خاک کہاں تک برداشت کروں۔''

''غبارِ ایّام'' فیضؔ کا آخری مجموعۂ کلام ہے، جس کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ اسی لحاظ سے بیدلؔ کا مذکورہ شعر فیضؔ کی اسی نفسیاتی کیفیت کا مظہر بھی ہے کہ وہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ اب زندگی کا سفر اختتام پذیر ہونے والا ہے اور وہ زندگی کی خاکِ پریشاں کو غبار ہوتا ہوا دیکھ رہے تھے۔

علامہ محمد اقبالؔ: (۱۸۷۷ء-۱۹۳۸ء)

ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؔ 'حکیم الامت'، 'فلسفی'، 'مفکرِ اسلام' اور 'شاعرِ مشرق' جیسے القابات سے جانے جاتے ہیں۔ علامہ اقبالؔ نے اگرچہ فارسی کی تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن فارسی غزل کی ہیئت اور فن کے اعتبار سے بظاہر قدیم فارسی غزل سے مشابہت رکھتی ہے لیکن فکر و فن اور موضوع اور اسلوب کے حوالے سے منفرد مقام رکھتے ہیں۔ علامہ اقبالؔ نے اپنے مخصوص رمزیہ انداز میں ملّی جذبوں کو اس طرح پیش کیا کہ غزل کا رنگ و آہنگ بھی قائم رہا اور تنگنائے غزل کی نئی وسعتیں اور نئی جہتیں بھی حاصل ہو گئیں اور اس کے ساتھ فارسی غزل کی ایک نئی روایت نے بھی جنم لیا۔

''علامہ اقبالؔ کے کلام میں سعدیؔ کے کلام کی سادگی اور صفائی، حافظؔ کے کلام کا رمزیہ انداز اور بیدلؔ

کا مفکرانہ اجتماعی شعور ہی نہیں ملتا بلکہ انفرادی زندگی، اجتماعی زندگی اور ملی زندگی کے مسائل کا مفکرانہ اور مصلحانہ اندازِ بیان بھی پایا جاتا ہے اور علامہ اقبال کا مقام فارسی غزل گوئی میں منفرد اور ممتاز ہے۔‘‘(۱۲)

گو کہ یہ انفرادیت انھیں اردو میں بھی حاصل ہے مگر فارسی میں وہ اس لحاظ سے زیادہ مرتبے پر فائز ہیں اور انھیں انفرادی خوبیوں کی وجہ سے علامہ اقبال، فیض کی بھی پسندیدہ ترین شخصیات میں شامل ہیں۔ جن پر انھوں نے نظمیں بھی لکھیں اور مقالات بھی تحریر کیے ہیں۔ ان نظموں اور مقالات کو شیما مجید نے ’’اقبال‘‘ کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔
نظموں میں سے ایک نظم بعنوان ’’اقبال‘‘ ان کے مجموعۂ کلام ’’نقشِ فریادی‘‘ میں شامل ہے۔ نظم یہ ہے:

اقبال

آیا ہمارے دیس میں اِک خوش نوا فقیر — آیا اور اپنی دھن میں غزل خواں گزر گیا
سنسان راہیں خلق سے آباد ہوگئیں — ویران میکدوں کا نصیبہ سنور گیا
تھیں چند ہی نگاہیں جو اس تک پہنچ سکیں — پر اس کا گیت سب کے دلوں میں اتر گیا

اب دُور جا چکا ہے وہ شاہِ گدا نما — اور پھر سے اپنے دیس کی راہیں اداس ہیں
چند اک کو یاد ہے کوئی اس کی ادائے خاص — دو اک نگاہیں چند عزیزوں کے پاس ہیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں مقیم ہے — اور اس کی لَے سے سینکڑوں لذت شناس ہیں

اس کے گیت کے تمام محاسن ہیں لازوال — اس کا وفور، اس کا خروش، اُس کا سوز و ساز
یہ گیت مثل شعلۂ جوالہ تُند و تیز — اس کی لپک سے بادِ فنا کا جگر گداز
جیسے چراغ وحشتِ صرصر سے بے خطر — یا شمعِ بزم، صبح کی آمد سے بے نیاز

دوسری نظم جس کا عنوان بھی ’’اقبال‘‘ ہی ہے جو کہ فیض نے ۱۹۳۳ء میں لکھی، فیض کے کسی مجموعۂ کلام میں شامل نہیں ہے، یہ نظم(۱۳) شیما مجید نے اپنی مرتب کردہ کتاب میں شامل کی ہے، نظم یہ ہے:

اقبال

زمانہ تھا کہ ہر فرد اِنتظار موت کرتا تھا — عمل کی آرزو باقی نہ تھی بازوئے انساں میں
بساطِ دہر پر گویا سکوتِ مرگ طاری تھا — صدائے نوحہ خواں تک بھی نہ تھی اس بزمِ ویراں میں

رگِ مشرق میں خونِ زندگی تھم تھم کے چلتا تھا — خزاں کا رنگ تھا گلزارِ ملت کی بہاروں میں
فضا کی گود میں چپ تھے ستیز انگیز ہنگامے — شہیدوں کی صدائیں سو رہی تھیں کارزاروں میں

سنی واماندۂ منزل نے آوازِ دَرا آخر
ترے نغموں نے آخر توڑ ڈالا سحرِ خاموشی
مئے غفلت کے ماتے خوابِ دیرینہ سے جاگ اٹھے
خود آ گاہی سے بدلی قلب و جاں کی خود فراموشی

''عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا''
فسردہ مشتِ خاکستر سے پھر لاکھوں شرر نکلے
زمین سے نوریانِ آسمان پرواز کہتے تھے
''یہ خاکی زندہ تر، پائندہ تر، تابندہ تر نکلے''

نبود و بود کے سب راز تو نے پھر سے بتلائے
ہر اِک فطرت کو تو نے اس کے امکانات جتلائے
ہر اِک قطرے کو وسعت دے کے دریا کر دیا تو نے
ہر اک ذرے کو ہمدوشِ ثریا کر دیا تو نے!

فروغِ آرزو کی بستیاں آباد کر ڈالیں
زجاجِ زندگی کو آتشِ دوشیں سے بھر ڈالا
طلسمِ کن سے تیرا نغمۂ جانسوز کیا کم ہے
کہ تو نے صد ہزار فیونیوں کو مرد کر ڈالا

علامہ اقبال کی فکر وفن پر فیض احمد فیض کی اردو تحریروں کے عنوانات درج ذیل ہیں:

۱-اقبال،فن اور حصارِ فکر،۲-سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو---جذبات اقبال کی بنیادی کیفیت،۳-ہماری قومی زندگی اور ذہن پر اقبال کے اثرات،۴-فکرِ اقبال کی ارتقائی منزلیں، ۵-اقبال اپنی نظر میں،۶-روزگارِ فقیر(مقدمہ)،۷-جستہ جستہ---(اقتباسات)

اور انگریزی تحریریں یہ ہیں:

1-Iqbal--The Poet

2-Muhammad Iqbal

(شیما مجید نے ان انگریزی مقالوں کا اردو ترجمہ بھی ساتھ ہی شائع کیا ہے جو کہ بالترتیب شاہد علی نے ''محمد اقبال'' اور سید سجاد باقر رضوی نے ''کلامِ اقبال کا فنی پہلو'' کے نام سے کیا ہے۔)

ان مضامین کی خاص بات یہ ہے کہ فیض نے ان میں اقبال کو اپنی نظر سے دیکھنے کی بجائے خود اقبال کی نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔فیض کہتے ہیں:

''آج کے دور میں اگر شعرا میں سب سے مظلوم کوئی ہے تو وہ شاید علامہ اقبال ہی ہیں۔ہر نقاد اور ہر مبصر نے اقبال کو اپنے اپنے نظریات، خیالات اور عقائد کی اقلیم میں کھینچ تان کر لانے کی کوشش کی ہے۔۔۔''(۱۴)

جس سے اقبال کے نظریات کو سمجھنا ذرا مشکل ہو گیا ہے۔اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اقبال کے مصرعوں یا اشعار کو اپنے خیالات کے مطابق ڈھالنے کی بجائے اپنے خیالات و نظریات کو اقبال کے فلسفے کے مطابق ڈھالیں۔

فیض، اقبال کا انگریزی نقادوں کے نقطۂ نظر سے مطالعہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"No man was ever yet a great poet" wrote that very discerning

critic Coleridge , "with being at the same time a great philosiper".This formulation may or may not be entirely acceptable in the West but in the East ,particularly among the Muslim peoples a succession of great names bears ittestimony"(15)

فیض انہی وجوہات کی بنا پر اقبالؔ کو پسند کرتے تھے اور اقبالؔ نے فارسی غزل میں جس طرح ملی جذبوں کا اظہار اپنے مخصوص رمزیہ انداز میں کر کے ایک نئی روایت کو جنم دیا اسی طرح فیض نے اپنے انقلاب والے کمیونزم اور سوشلزم کے نظریات کو اردو غزل میں ایک نئی روایت کو قائم کیا۔ فیضؔ، اقبالؔ سے بے حد متاثر تھے اور اس کی وجہ وہ خود کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''اقبال سے متاثر ہونا میرے لیے بالکل فطری تھا میں سب سے زیادہ ان کی فکر سے متاثر ہوا ہوں کہ انسان اپنے اندر بے پناہ قوتیں رکھتا ہے اور تمام عظمتیں اسی کے لیے ہیں اقبال کے اسلوب سے میں نے بہت کچھ لینے کی کوشش کی ہے۔ میں نے اقبال ہی سے سیکھا ہے کہ فن ریاضت چاہتا ہے، ریاضت کے بغیر شعر میں نغمگی اور موسیقی اور تاثیر پیدا نہیں ہوتی۔ اقبال کی زندگی کے مطالعے ہی سے میں نے یہ جانا کہ شاعری ہمہ وقتی انہاک، توجہ اور ریاضت کا تقاضا کرتی ہے''(۱۶)

فیضؔ نے اقبالؔ سے نہ صرف رہنمائی حاصل کی وہ تو ان کے بہت بڑے معترف بھی تھے آپ نے نہ صرف انھیں منظوم خراجِ تحسین پیش کیا بلکہ ان کا ایک شعر اپنے مجموعۂ کلام ''شامِ شہرِ یاراں'' میں نقل کیا ہے۔ شعر یہ ہے:

گماں مبر کہ بپایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

یہ شعر اقبالؔ کے مجموعۂ کلام ''پیامِ مشرق'' میں شامل نظم ''حیاتِ جاوید'' کا مطلع ہے۔ اس میں اقبال کہتے ہیں کہ:

''یہ مت گمان کرو کہ ساقی کا کام ختم ہو گیا ہے ابھی تو انگور کی شاخ کی رگوں میں نہ جانے کتنی شرابیں موجود ہیں، جنھیں پیا جانا ہے۔''

غنی کاشمیری: (۱۰۴۰ء-۱۰۷۵ء)

حضرت ملا طاہر غنی کاشمیری، کشمیر کے نامور اور ترقی پسند شاعر، پیر و فقیر ہیں۔ آپ شاہ جہاں کے زمانے میں پیدا ہوئے۔ آپ نے زہد و قناعت اور علم و معرفت کے ساتھ ساتھ فارسی ادب میں بھی بلند مقام حاصل کیا۔

''دنیا انھیں ایک صاحبِ طرز شاعر کی حیثیت سے جانتی ہے لیکن حقیقت میں ملا طاہر غنی ایک عالی

مرتبہ حریت پسند اور محبِّ وطن رہنما بھی تھے۔ ان کی ہمیشہ سے خواہش تھی کہ کشمیر آزادی کی دولت سے مالا مال رہے اور فرزندانِ کشمیر اپنی صلاحیتوں کی بدولت اپنے وطن کی خدمت میں مصروف رہیں۔ اس بنا پر انھوں نے کشمیر سے باہر قدم رکھنا گوارا نہ کیا اور جب وہ مادرِ وطن کے فرزندوں کو کشمیر سے باہر اعلیٰ قابلیتوں کی دھاک بٹھاتے ہوئے دیکھتے تو بے اختیار کہہ اٹھتے تھے۔''(۱۷)

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

غنی کاشمیری نے یہ شعر کشمیریوں کے لیے استعمال کیا لیکن فیض نے اس شعر کے مفہوم کو اپنی ذات کے ساتھ جوڑ کر کچھ اس طرح بیان کیا:

فیض، نہ ہم یوسف نہ کوئی یعقوب جو ہم کو یاد کرے
اپنی کیا، کنعاں میں رہے یا مصر میں جا آباد ہوئے

یہ امر قابل ذکر ہے کہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ دانشوروں نے غزل کو جاگیردارانہ دور کی پیداوار قرار دیا تھا اور وہ اسے معاشرتی زوال کی علامت قرار دیتے تھے اور ان کے خیال میں غزل محدود موضوعات کی صنف ہے اور اس کے اندر وہ قوت نہیں ہے جو معاشرے میں انقلاب کا باعث بن سکے۔

فیض نے فارسی غزل کی کلاسیکی جمالیات کو ایک نئے اخلاقی مفہوم میں قبول کیا اور یہ ثابت کیا کہ غزل کے متن کو محدود مضمون میں نہ لیا جائے۔ غزل اختصار اور ایماء کی قائل ضرور ہے لیکن اس کے اندر وہ مضمون کی بے پناہ وسعت پائی جاتی ہے کہ غزل کا ہر ایک شعر کئی ایک سماجی موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔ فیض نے غزل کے اسی رمزیہ اسلوب کا ادراک حاصل کیا کم وبیش اپنی ہر کتاب کے سرورق پر فارسی کے کسی نہ کسی غزل گو کا کوئی شعر انقلابی مفہوم میں سرنامہ کے طور پر درج ہے اور جب ''بین الاقوامی لینن امن انعام'' کی تقریب میں اپنی بات کو اختتام تک پہنچایا تو انھیں شیراز کے خواجہ حافظ کا یہ شعر یاد آیا:

خلل پذیر بود ہر بنا کہ مے بینی
بجز بنائے محبت کہ خلل از خلل است

❑❑❑

حوالہ جات

۱۔ شمس الرحمٰن فاروقی، ''فیض اور کلاسیکی غزل''، مشمولہ ''شاعر خوشنوا ـــ فیض احمد فیضؔ''، مرتبہ ڈاکٹر طاہر تونسوی، لاہور، نستعلیق مطبوعات، س ۲۰۱۱ء، ص ۴۷

۲۔ محمد صدیق، ڈاکٹر، صدیق شبلی، ڈاکٹر ''فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ''، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۲ء، ص ۸۲

۳۔ ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر، ''فارسی غزل اور اس کا ارتقاء''، لاہور، مجلس تحقیق و تالیف فارسی، گورنمنٹ کالج، ۱۹۹۳ء، ص ۳۸۳

۴۔ علی ابیات، ڈاکٹر، ''حافظ شیرازی''، مشمولہ ''ایران نوین''، ماہنامہ، ص ۳۰

۵۔ فیض احمد فیضؔ، ''تقریر''، مشمولہ ''نسخہ ہائے وفا''، لاہور، مکتبۂ کارواں، س ن، ص ۲۹۹-۳۰۲

۶۔ شبلی نعمانی، ''شعر العجم'' (جلد دوم)، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، س ن، ص ۵۳-۵۴

۷۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، ''فارسی زبان و ادب'' (مجموعۂ مقالات)، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۷ء، ص ۴۰

۸۔ شبلی نعمانی، ''شعر العجم'' (جلد سوم)، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، س ن، ص ۸۸

۹۔ ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر، ''فارسی غزل اور اس کا ارتقاء''، لاہور، مجلس تحقیق و تالیف فارسی، گورنمنٹ کالج، ۱۹۹۳ء، ص ۳۲۱

۱۰۔ احمد سلیم، مرتب، ''موجِ زَر''، لاہور، نگارشات، ۱۹۹۰ء، ص ۱۸۷

۱۱۔ عبداللہ، سید، ڈاکٹر، ''فارسی زبان و ادب'' (مجموعۂ مقالات)، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۷ء، ص ۳۶۵

۱۲۔ ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر، ''فارسی غزل اور اس کا ارتقاء''، لاہور، مجلس تحقیق و تالیف فارسی، گورنمنٹ کالج، ۱۹۹۳ء، ص ۵۵۴، ۵۵۵

۱۳۔ فیض احمد فیضؔ، ''اقبال''، مشمولہ ''اقبال''، مرتبہ: شیما مجید، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۹ء، (اشاعت دوم) ص ۸۷

۱۴۔ فیض احمد فیضؔ، ''اقبال''، مرتبہ: شیما مجید، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۹ء، (اشاعت دوم) ص ۴۳

۱۵۔ فیض احمد فیضؔ، ''Muhammad Iqbal''، مشمولہ ''اقبال''، مرتبہ: شیما مجید، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۹ء، (اشاعتِ دوم) ص ۸۷

۱۶۔ فیض احمد فیضؔ، ''اقبال''، مرتبہ: شیما مجید، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۸۹ء، (اشاعت دوم) ص ۸۵

۱۷۔ مہ جبین، ''اقبال اور کشمیر''، مقالہ برائے ایم۔اے اردو ۱۹۷۴ء، یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، ص ۵۸، ۵۹

کیتھی سانگ کی نظمیں

–ترجمہ: محمد حمید شاہد–

تصویری دلہن

وہ مجھ سے سال بھر بڑی تھی
وہ تیئیس سال کی تھی کہ جب وہ کوریا سے نکل گئی تھی
کیا اس نے محض اپنے باپ کے گھر کا دروازہ بھیڑا اور نکل کھڑی ہوئی تھی؟
یا پھر یہ ایک طویل مسافت تھی
پوسن کے درزی کی دکان سے ہوتی ہوئی
سمندر کے اس کنارے تک جہاں جہازوں میں سامان بھرا جاتا ہے
اور جہاں ایک کشتی اسے ایک جزیرے پر لے جانے کے لیے منتظر تھی
یہ ساحل ایسا تھا کہ اس کا نام اس نے محض حال ہی میں پڑھا تھا
اور سمندر کے اسی کنارے (کی طرف)
واولیا کے کھانڈ کے کارخانے سے باہر کیمپ میں جب لالٹین روشن ہوئی
ایک شخص اپنے کمرے میں اس کی تصویر لالٹین کی بتی کے رخ پر کیے اس کے انتظار میں تھا
پتنگے جو کمادکی پاندوں سے باہر نکل رہے تھے' اپنے پروں سے جگمگا رہے تھے
وہ کیا چیز ہے کہ جس کی وجہ سے میری دادی اماں نے اس سے بات کی ہوگی؟
اور جب اس اجنبی کے چہرے کو دیکھنے کا مرحلہ آیا ہوگا'
وہی جو اس کا شوہر تھا' اس سے تیرہ سال بڑا
تو کیا اس نے نرمی سے اپنی جیکٹ کی ریشمیں گرہ کو ڈھیلا کیا ہوگا'

اس کے تنبو کی صورت بناتے پیرہن میں تب سے خشک ہوا بھر گئی تھی
جب وہ باہر کھیتوں میں ادھر ادھر چل رہی تھی
وہاں، جہاں لوگ کماد کو الاؤ میں جھونک کر جلا رہے تھے۔

☆☆☆

جواں سال بیٹی

کئی برسوں سے
آسمان تاریک چلا آ رہا ہے
میری جلد دھانی کاغذ کی طرح مرطوب اور پیلی ہو گئی ہے
اور اسی نہج پر سوچنے لگی ہوں
جس نہج پر میری ماں اس وقت سوچا کرتی جب
باہر خشک کھیتوں میں سورج جل بھن رہا ہوتا

بعدازاں، جب میں نے اپنے پپوٹے کو چھوا
میرے ہاتھ نے کچھ یوں ردِعمل ظاہر کیا کہ جیسے میں نے بہت ہی جلتی شئے کو چھوا تھا
اتنی جلتی ہوئے شئے کو، کہ جو جلا ڈالنے کے لیے کافی تھی
میری جلد، اسپرین کے رنگ جیسی،
دردِ شقیقہ سے تھرائی تھی۔
ماں میرے چہرے کی دائیں جانب سے پیغام دیتی ہے
خاص طور پر شام سمے جب درد کی شدت بھڑک اُٹھتی

اس صبح اس کی سانسوں میں رڑک تھی
اور اس کی آواز محبت کے احساس کی وجہ سے بیٹھنے لگی تھی
جب میں اس کی چلتی کرسی کو دھکیل کر غسل خانے تک لے گئی تھی
وہ اپنی بھاری چھاتیوں کے حوالے سے،
جو کہ دودھ جیسے پانی کے اُوپر
سخت جلد اور چربی والی سیل کی طرح تیر رہی تھیں
شگفتہ مزاجی پر اُتر آئی تھی

بھٹنیوں کے گرد جلد ڈھیلی ہو کر جھریاں بنا رہی تھی
میں نے انہیں رگڑا تو میرا منہ کھٹے ذائقے سے بھر گیا
یہ سوچتے ہوئے کہ چھ بچے اور ایک بڑی عمر کا آدمی
ان بھوری بھٹنیوں کو چوڑتے، اسے پیتے رہے تھے
میں لگ بھگ دل گرفتہ ہو چکی تھی
جب میں نے اس کے جسم کے اس حصے کو دیکھا جو نیلا پڑ چکا تھا
یہ جلد کا وہ حصہ تھا جہاں وہ گزشتہ تیس سال سے انسولین کے ٹیکے لگاتی رہی تھی
میں نے اس کی جلد پر دھیرے دھیرے جھاگ بنائی اور ملنے لگی
اس نے گہرائی میں دیکھا اور اس کی آنکھیں مندمل ہونے لگیں
یوں لگتا تھا وہ تو ہمیشہ سے ایسی تھی
ہم دونوں ہی بالکل ایسے تھے، اس بے دھوپ کمرے میں
غسل کے پانی میں یوں ہی چھپاکے مارتے ہوئے

پچھلے پہر میں،
جب وہ پرسکون تھی
اس نے ہمارے لیے معمول کے مطابق چائے کا اہتمام کیا
اور پلاؤ کا بھی جسے ادرک کی کترنوں اور مچھلی سے سجایا گیا تھا
شلجم کے اچار کی ایک پھانک اس کے ساتھ تھی
ایک محبت کی نشانی جو میرے مرمریں جسم کے لیے تھی
ہم نے ایک مانوس خامشی میں اس سے حظ اُٹھایا
وہ جانتی ہے کہ میں وہ نہیں ہوں جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہو
حتیٰ کہ اس سے کہ جب میں بھاگ نکلنے کے منصوبے بنا رہی ہوں
جوں ہی میں نے اس کے لیے چائے کی پیالی کو سلامتی کے جام کے طور پر لیا
تب کہ جب وہ پیالی میں چائے اُنڈیل چکی تھی
ہزاروں کونجیں کھڑکی سے پرے اُڑیں
اور اچانک چل پڑنے والی ہوا میں اُڑنے لگیں۔

☆☆☆

جھل پکھیاں

اس کی صبحیں مرمریں ہوتی ہیں یا آسمانی
یوں جیسے ناشتے کی میز پر بچھا کپڑا
وہ گھر میں مسرور ہے
ایک چمچ کو چھو لینے سے
پرندے اس کی کرسی تلے جمع ہو گئے ہیں
وہ گنگناتا ہے اور پلیٹیں غائب ہو جاتی ہیں

یا پھر یوں ہے کہ
ایک رنگین چاک کو تھامنا، یوں کہ جیسے موم بتی کو تھامتے ہیں
وہ ایک دائرہ بناتا ہے
یہ اس کی بنائی ہوئی سویں کابلی مکھی ہے
جو مزید کاغذ کا مطالبہ کر رہی ہے
اس والی کے پر شنگرفی ہیں
اور دوسریوں کی طرح، اس کے بارے میں بھی
وہ یہ خواہش رکھتا ہے کہ یہ اڑے
جوں ہی وہ اپنے کچے دستخطوں کی مدد سے مدور لکریں کھینچ چکے

جھل پکھیاں، وہ انہیں نام دیتا ہے
یوں تیرنا کہ اس کے تیرتے بازوؤں کے عقب میں
لہریں پٹی سی بنا دیں
(بالاپوش کی پٹی کی طرح)
میں تردّد کے بالاپوش کو پہن لیتی ہوں
پرندوں سے بھری صبح کو حرکت دینے کے لیے
وہ پانی کی سمت پلٹتا ہے
وہاں سے اسے اِلیچتے ہوئے، جہاں سے کہ وہ تخ ہے

دھوپ کی سمت متحرکت اور تیز آواز پیدا کرتے ہوئے
یہاں سے یہ پانی یوں لگتا ہے کہ جیسے وہ سونے کی ٹکیا ہو گیا ہو

میں دائرے دیکھتی ہوں
(وہ دائرے جو) اس کا مختصر جسم بناتا ہے
پنکھے کی طرح گھومتے اور لہریئے بناتے ہوئے
یوں بکھرتے ہوئے، جیسے ایک بازگشت سارے میں پھیل جاتی ہے
پانی میں، روشنی میں اور ہوا میں ۔۔۔ایک ساتھ
تاہم پانی پر نقش (اس بازگشت) کے پاس
ایک قلیل عرصہ حیات ہوتا ہے
ایک کابلی مکھی کے شفاف پروں کے لرزنے کا سا

یہی دکھ ہے: میں اپنے آپ سے کہتی ہوں
کہ صبح وہ اپنے پروں کو پیچھے چھوڑ جانے کا فیصلہ کرتا ہے
کیوں کہ وہ یاد ہی نہیں رکھے گا کہ
وہ اور حسن کبھی بہم ہو گئے تھے
پانیوں کے اُوپر جھاگ کی طرح پار اترتے ہوئے،
یوں جیسے اسے ہوا نے جنم دیا ہو

اپنی پہلی خودکفیل اُڑان پر
میں لکھنا چاہوں گی کہ کیسے وہ اپنے آپ میں خوشی کو سہار نہیں پا رہا تھا
جب کہ دوسری جانب
کسی اور وقت کے کھانچے میں
وہ میرا انتظار کرتا ہے
پہلے سے فاصلوں پر رکھے ہوئے جسم کے باوصف
ایک وہ جو میرے ہاتھ سے یوں پھسل گیا تھا، جیسے کہ مچھلی پھسل جاتی ہے۔
تیرتے ہوئے، اپنے آپ میں آزاد۔
☆☆☆

مجھے سوچنے دو

—مظہر بخاری—

مَیں نے دیکھا ہے تم کو کہیں
کون ہو۔۔۔!
سوچنے دو مجھے
تم وہی تو نہیں
جس کو صدیوں رکھا چاک پر
رنگ فطرت کے سارے بھرے
جس کو اذنِ سخن دے کے
مَیں سوچتا ہوں
کہ یہ مجھ سے کیا ہو گیا
اے مری روشنی، میری آنکھیں، مرے دِل!
اگر یہ حقیقت ہے
تو! پھر تم آؤ
کھڑے کیوں ہو باہر
یہ کس خوف میں مبتلا ہو
تمہارے لیے میرا آنگن کھلا ہے

رُکو
تم کہاں جا رہے ہو
چلو ٹھیک ہے
جاؤ مجھ کو تمہاری ضرورت نہیں
واقعی تم چلے جاؤ گے!!!
تم کو جلدی ہے کس بات کی
مَیں نے جی بھر کے دیکھا نہیں ہے تمھیں
آؤ کچھ دیر کو ''لان'' میں بیٹھتے ہیں
تمھیں یاد ہو گا
کبھی ہم یہاں بیٹھ کر چائے پیتے تھے
ہنستے تھے
اور خواب بنتے تھے اچھے دِنوں کے
ارے کچھ تو بولو
تم اتنے دِنوں تک کہاں پر رہے۔۔۔
کیا ہوا

چل دیے تم کہاں پر مجھے چھوڑ کر
مَیں اکیلا کہاں تک رہوں گا
سنو!!!
تم مجھے چھوڑ کر اَب نہیں جاؤ گے
تم وہ کردار ہو
جس کے ہونے سے مَیں ہوں
یہ کارِ جہاں ہے
زمیں آسماں ہے
کہانی ادھوری کہاں تک رہے گی
یہ کس سوچ میں پڑ گئے
کیا کیا۔۔۔
''سوچنے دو مجھے''
ٹھیک ہے
مَیں یہی چاہتا ہوں
مجھے سوچنے دو
مجھے سوچنے دو!!!!

☆:☆:☆

وہ صاحبِ اجمیر نگر کیسا لگا ہے؟

—ناصر بشیر—

تم کو یہ عقیدت کا سفر کیسا لگا ہے؟
وہ صاحبِ اجمیر نگر کیسا لگا ہے؟
''اب لوٹ کے آئے ہو تو گھر کیسا لگا ہے؟''☆
اور گھر کا ہر اِک خاک بسر کیسا لگا ہے؟

ایسے ہی اندھیرے ہیں اُدھر یا ہے اُجالا؟
کیا کوئی غریبوں کا بھی ہے پوچھنے والا؟
گہنایا ہوا روئے بشر کیسا لگا ہے؟
تم کو یہ عقیدت کا سفر کیسا لگا ہے؟

ایسی ہی گِرانی ہے اُدھر جیسی اِدھر ہے؟
یا صاحبِ بازار کو قانون کا ڈر ہے؟
مصروفِ دُعا ، دستِ ہنر کیسا لگا ہے؟
تم کو یہ عقیدت کا سفر کیسا لگا ہے؟

کس بھاؤ وہاں بکتا انسان؟ بتاؤ!
کچھ کارِ تجارت کا ہے اِمکان ؟ بتاؤ!
انساں کا بدن خون میں تر کیسا لگا ہے؟
تم کو یہ عقیدت کا سفر کیسا لگا ہے؟
وہ صاحبِ اجمیر نگر کیسا لگا ہے؟

☆ شفیق سلیمی کا مصرعہ ہے۔

سچ کے لیے پہلے سفر کی تمہید

-خاور جیلانی-

مصور کینوس پر خون کے چھینٹے بناتا ہے
ہمارے منہ میں
وحشی بھیڑیوں کے دانت اُگتے ہیں
ہم ایسے لوگ ہیں
جو سچ کو منوانے کی خاطر جھوٹ بکتے ہیں
اور اپنی جاہلیت کو چھپانے کے لیے
ان مسخروں کا رول کرتے ہیں
جنہیں ہر اِک قلابازی پہ
اپنے چاہنے والے تماشائیوں کے ہاتھوں
بے تحاشا تالیوں کی داد ملتی ہو
کسی کی جی حضوری کاٹ کر
معدے میں پھیلے قحط کی اینٹھن مٹانے کے لیے
ہرزہ سرائی کو بقا کا گیت لکھتے ہیں
جہنم کے سفارت کار سورج پر
شجر کاری کے منصوبے بناتے ہیں
مگر گھر میں اُگا برگد پنپنے پھولنے پھلنے نہیں دیتے
ہمارا سانحہ ہے ہم
خطا کاری کا جوہر آزمالینے کا
حق محفوظ رکھنے کے لیے
اپنے خدا کو بھول جاتے ہیں
مگر اسی سے معافی
چاہنے والی دُعائیں یاد رکھتے ہیں
مصور کینوس پر خون کے چھینٹے بناتا ہے

ایک چہرہ!

—سرورعالم رازسرور—

یہ ایک چہرہ جو ہر جھروکے سے جھانک کر مجھ کو دیکھتا ہے
یہ مجھ پہ ہے خندہ زن کہ جیسے ہمیشہ میرا خدا رہا ہے!
میں سوچتا ہوں کہ اِبتدا ہے مری یہ چہرہ، کہ انتہا ہے؟

یہی حقیقت کی جستجو ہے ، یہی محبت کی گفتگو ہے
کبھی یہ دُنیا ہے آرزو کی ، کبھی مداوائے آرزو ہے
کبھی ہے یہ بازگشت ہستی ، کبھی یہ رنگ رگ گلو ہے
اسی کا شہرہ ہے قریہ قریہ ، اسی کی آواز کو بہ کو ہے

نیاز و ناز و ادا و عشوہ ، خرام یہ ، بانکپن یہی ہے
ثواب ایمان و زہد یہ ہے ، عذاب دار و رسن یہی ہے
شباب و شعر و سخنوری یہ ، روایت فکر وفن یہی ہے
تماشۂ حسن و عاشقی کی ہری بھری انجمن یہی ہے

کبھی ہے پوشیدہ ہر نظر سے ، کبھی زمانہ پہ یہ عیاں ہے
کبھی ہے موسم بہار کا اور کسی گھڑی روکش خزاں ہے

کبھی ہے یہ ذِکر شامِ فرقت، کبھی یہ خلوت کی داستاں ہے
کبھی اساس یقیں ہے یہ اور کبھی یہ دُنیائے صد گماں ہے

تمام حرف وفا یہی ہے، مقام و جور و جفا یہی ہے
جسارتوں کی عطا یہی ہے، محبتوں کی سزا یہی ہے
یہی خطائے اُمیدواری، دُکھے دِلوں کی صدا یہی ہے
اگر ہے اس خارزارِ ہستی میں کوئی اِک نقشِ پا، یہی ہے!

ستم شعاری، فریب کاری کے سب طلسمی یہ کارخانے
حکایتِ غم، شکایتِ دِل، اسی سے تازہ ہیں سب فسانے
اسی سے زندہ ہے 'آج' میرا اسی سے گزرے ہوئے زمانے
مری اُمیدیں، مری مرادیں، مری تمنّا، مرے بہانے

مچلتی بانہیں، سرکتا آنچل، کھنکتی پازیب، بجتے گھنگھرو!
غبار اُمید، شامِ ہجراں، اُداس آنکھیں، چھلکتے آنسو!
تھکے قدم، سوگوار لمحے، حیا کی لرزش، بدن کی خوشبو!
وہ لذتوں کا سرور ہر دم، وہ وحشتوں کا ہجوم ہر سو!

یہ ایک چہرا جو ہر جھروکے سے جھانک کر مجھ کو دیکھتا ہے
یہ مجھ پہ ہے خندہ زن کہ جیسے ہمیشہ میرا خدا رہا ہے!
یہی تو ہے رازدانِ ہستی، یہی تو جام جہاں نما ہے!
میں سوچتا ہوں کہ اِبتدا ہے مری یہ چہرا، کہ انتہا ہے؟
مرا یہ چہرا! مرا یہ چہرا!

آسیب

– شکیل سالک –

گھروں سے دُور تھا اِک سمت دشت میں
اِک گھر
کہ جس کے واسطے بستی کے لوگ کہتے تھے کہ اِس
مکان میں آسیب کا بسیرا ہے
مگر میں اپنی طبیعت کے سحر میں آ کر
اندھیری رات میں اُس گھر کی سمت
چل نکلا
قریب جا کر جو دیکھا تو واقع سچ تھا
مکاں کے فرش پر دو چار بھوت بیٹھے تھے
جو کہہ رہے تھے کہ اب ہجرتیں ضروری ہیں
ہمارے سامنے بستی ہے دُنیا والوں کی
اگر وہ آ گئے ہم جان سے بھی جائیں گے
چلو چلو کہ یہ بے جرم مار دیتے ہیں
بنا کفن کے لحد میں اُتار دیتے ہیں
نہ ان کے سامنے رِشتوں کی ہے اوقات کوئی
یہ ہیں تو انساں مگر اِن کی نہیں ذات کوئی
شکیلؔ اُن کی یہ باتیں سن تو کہنے لگا
کہ اب انسان سے اِک جن بھی دُور رہنے لگا

تھوتھن بھنورا

—محمد حمید شاہد—

شام پڑتے ہی اندھیرا سارے گھر میں تہ بہ تہ جمع ہونے لگا ہے۔ وہاں جہاں ٹرالی پر ٹی وی پڑا ہے۔ اس کے سامنے بچھے ایرانی قالین پر۔ دائیں جانب' جہاں ٹیک لگا کر بیٹھنے کے لیے ملتانی ٹانکے والے کشن پڑے ہوئے ہیں۔ اور یہاں اس بڑے صوفے پر' جس کے وسط میں میرا خوف سے نچڑا ہوا وجود پڑا ہوا ہے۔

اوہ' یہ نرا خوف نہیں ہے جو مجھے نچوڑ رہا ہے' ایک عجب نوع کی بے کلی اور شدید گہرے دکھ کا احساس بھی اس میں شامل ہو گیا ہے۔

ہاں تو میں اس اندھیرے کی بات کر رہی تھی' جو میرے ادھر ادھر سے بہتا ہوا آتا ہے' اوپر کی منزل کو جاتی سیڑھیوں سے نیچے لڑھکتا ہوا' تہ خانے میں اترتے راستے سے ابلتا ہوا۔ یہ سارے کا سارا اندھیرا میرے وجود پر جمتا چلا جاتا ہے۔ میں ایک ایک کر کے گھر کے سارے قمقمے روشن کر دیتی ہوں۔ وہ میری ٹانگوں سے چپک کر بیٹھ جاتا ہے۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنا چاہتی ہوں' مگر وہ مجھے نظر نہیں آتا۔

''شینا' شینا''

''جی امی جی''

''دیکھ، تھوتھن بھنورا' تیری ٹانگوں میں گھس رہا ہے۔''

میری ماں نے اس ننھے منے کتے کا نام تھوتھن بھنورا شاید اس لیے رکھ چھوڑا ہے کہ اس کے روئی جیسے لمبے بالوں کے اندر اس کی گردن غائب ہونے کی وجہ سے سیاہ تھوتھنی قدرے زیادہ نمایاں ہو گئی ہے اور وہ مجھے دیکھتے ہی بھنورے کی طرح میرے ادھر ادھر چکر کاٹتا رہتا ہے۔

جب بھی میری ماں، میرے اس لاڈلے کتے کا نام لیتی' اتنا سنوار کر اور اہتمام سے لیتی کہ میں ماں کے شفیق چہرے کی جانب دیکھنے پر مجبور ہو جاتی۔

میں ماں کو دیکھ رہی ہوں مگر جھک کر' تھوتھن بھنورے کو بھی چھونا چاہتی ہوں۔ وہ اپنی تھوتھنی اُٹھا کر میری اُنگلیاں چاٹنے لگتا تو میں تھوتھنی کے گیلے پن سے بچنے کے لیے اپنا ہاتھ کھینچ لیتی ہوں۔ اسے میرا اُنگلیاں ہتھیلی میں سمیٹ کر یوں ہاتھ اوپر اٹھا لینا ناگوار گزرتا ہے۔

میں اب بھی ماں ہی کے چہرے پر نظریں گاڑے ہوئے ہوں تاہم مجھے فوراً اس کے اپنے آپ میں سمٹنے کی خبر ہو گئی ہے۔ اس کی بالوں بھری پیٹھ' جو میری ٹانگوں سے رگڑ کھا رہی تھی' الگ ہو گئی ہے۔ اس نے پل بھر میں اپنا بدن سمیٹ لیا ہے۔ یہ بھی اس کے ناراض ہونے کی ایک ادا ہے۔ میں چونک کر اپنی ٹانگوں میں اسے دیکھتی ہوں۔ وہاں' جہاں ابھی ابھی وہ تھا۔ وہ وہاں نہیں ہے۔ میں گھبرا کر ٹانگوں کے آس پاس نگاہ دوڑاتی' اور عقب میں بھی کہ بالعموم وہ میرے پیچھے چھپ جایا کرتا تھا۔ وہ وہاں بھی نہیں ہے۔ میں باہر دروازے کی طرف دیکھتی ہوں تو ایک سایہ سا باہر کی جانب لپکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ میں بھی ادھر لپکتی ہوں اور کیا دیکھتی ہوں کہ سیاہ تھوتھنی اجالے کو چیر کر باہر نکل گئی ہے اور ریشمیں اُجلی پیٹھ وہاں پھنسے اجالے میں تحلیل ہو گئی ہے۔ میں بوکھلا کر اسے پکارتی ہوں۔

''تھوتھن بھنورے' تھوتھن بھنورے۔''

مجھے ماں کی طرح اس کا پورا نام لینے میں دقت ہوتی ہے تو اس کا نام مختصر کر لیتی ہوں:

''بھنورے.....بھنورے......''

''شینا' شینا''

''بھنورے......''

''شینا......''

کب سے آوازیں گڈمڈ ہو رہی ہیں۔ میں لحاف کے اندر ہی اندر کسمساتی ہوں۔ مجھے یوں لگتا ہے ایک دروازہ ہے جو چوپٹ کھلا ہے اور اس کی چوکھٹ کے سارے احاطے میں آنکھوں کو چندھیا ڈالنے والی گاڑھی دھوپ پھنسی ہوئی ہے۔ یوں، جیسے اسے چوکور کاٹ کر وہاں ٹھونس ٹھانس کر پھنسا دیا گیا ہو۔

بھنورے......

میں آواز پھینکتی ہوں۔ دھوپ کی دیوار اسے لوٹا دیتی ہے۔

''شی......نا......''

میرے عقب سے آواز آتی ہے اور ٹوٹ کر اندھیرے میں گر جاتی ہے۔

میں چندھیائی آنکھوں سے دیکھتی ہوں اور مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔

رفتہ رفتہ میری آنکھیں دبیز اندھیرے سے مانوس ہو جاتی ہیں۔اب میں منھ سے لحاف الٹے بغیر اندازہ لگا لیتی ہوں کہ ابھی آدھی سے زیادہ رات باقی پڑی ہوئی ہے۔میں پہلو بدلتی ہوں، منھ پوری طرح کھول کر لمبے لمبے سانس لیتی ہوں اور انھیں ناک کے راستے آہستہ آہستہ اور روک روک کر خارج کرتی ہوں۔بار بار ایسا دھرانے سے میں نیند کو اپنی جانب راغب کرنے میں کام یاب ہو جاتی ہوں۔

''شینا......شینا''

ماں مجھے پاؤں کے سمت کھڑا ہو کر جگایا کرتی۔

وہ دھیرے دھیرے میرا نام لیتی، یوں جیسے سرگوشی کر رہی ہو یا یوں جیسے وہ اپنے حلقوم سے نکلے ہوئے میرے نام کو ہونٹوں سے ٹٹول رہی ہو۔یہ آواز ہر بار میری سماعتوں میں رسیلی گدگدی کی طرح اترتی ہے۔گدگدی کی طرح بھی اور لوری جیسی بھی۔کہ میں ہر بار لحاف کے اندر ہی اندر کسمسا کر رہ جاتی ہوں۔اور جب تک میری آنکھوں کے پپوٹوں پر کٹی ہوئی دھوپ کی قاش چبھنے نہ لگتی، میں جاگ اُٹھنے کو ٹالتی رہتی ہوں۔

رات ٹل چکنے کا اندازہ میں اپنے منھ کو لحاف میں گھسیڑے گھسیڑے کر لیا کرتی ہوں۔میں آنکھیں ایک دم نہیں کھولتی، پہلے اپنے ڈھیلے پپوٹوں کے اندر ہی اندر گھماتی ہوں، دائیں بائیں نہیں، دائروی صورت میں، یوں جیسے ان کے اندر رس رس کر آنے والی روشنی کو رگڑ رگڑ کر مٹانا چاہتی ہوں۔پھر پپوٹے باہم رکھے رکھے پھڑکانے کے بعد دھیرے سے آنکھیں کھول دیتی ہوں۔میں لگ بھگ ہر روز مشاہدہ کرتی ہوں کہ کثرتِ اِستعمال سے لحاف کے اندر، جہاں سے روئی اپنی جگہ چھوڑ گئی ہے، وہاں سے روشنی جھانکا کرتی ہے۔میں اس جھانکنے والی روشنی کی مقدار اور تیور دیکھ کر اندازہ لگا لیا کرتی ہوں کہ باہر سورج کس قدر اوپر چڑھ آیا ہوگا۔

اگرچہ میں پوری طرح جاگ گئی ہوں مگر لحاف سے نکل آنا اَب بھی مجھے گوارا نہیں ہے۔

تب، کہ جب میں چھوٹی تھی اور ہفتے بھر بعد چھٹی والا دن آتا تھا تو بھی مجھے یوں دیر تک بستر پر پڑے رہنا اچھا لگتا تھا۔ماں حسب عادت ایک مقررہ وقت پر دھیمی اور رسیلی آواز لڑھکا کر اپنے کام میں جت جاتی، اور میں دیر تک ایک خواب کی سی کیفیت میں پڑی رہتی۔اب بھی بالکل اسی طرح پڑے رہنا چاہتی ہوں۔اور یہ بھی چاہتی ہوں کہ ماں کی میٹھی پکار میرے کانوں میں قطرہ قطرہ ٹپکتی رہے۔

''شینا......شینا''

جب میں لحاف الٹ دینے کا قصد کرتی ہوں تب بھی میرے چاروں طرف ماں کی خوش بو پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔ میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہاں کوئی نہیں ہے۔ تاہم مجھے کچھ اور وقت کے لیے اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑتا ہے کہ اعصاب ڈھیلے کر کے پڑے رہنے سے' میری بوڑھی ہڈیوں پر ماس اور اعصابی ریشوں کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی ہے۔ حتیٰ کہ پڑے پڑے میرا پورا جسم دُکھنے لگتا ہے۔ یوں جیسے مجھے رات سوتا پا کر' تہ دار اندھیرا میرے اوپر کودتا رہا ہے۔

''شین......شین''

''بھئی اپنی لاڈلی کو سنبھالو، میری چھاتی پر چڑھ کر کود رہی ہے۔''

میں توصیف کی طرف محبت سے دیکھتی ہوں۔ مجھے ان کا محبت سے 'شین' کہنا بہت اچھا لگتا ہے۔ جس طرح وہ ہونٹ لٹکا لٹکا کر مجھے پکار رہے ہوتے، اس سے میں جان جاتی کہ وہ محض مجھے اس لیے متوجہ کر رہے ہوتے ہیں کہ میں بھی اُس لطف میں شریک ہو جاؤں جو اُنھیں ننھی تارا کو اپنی چھاتی پر چلا کر اور کودنے کے لیے اُکسا کر حاصل ہو رہا ہوتا ہے۔

تارا کلکاریاں مارتے ہوئے تیزی سے پاؤں چلاتی ہے۔ توصیف بے ساختہ ہنستے ہیں۔

میں ہنستے ہوئے اُٹھ بیٹھتی ہوں۔

ٹانگیں پسار کر بیٹھنے کے بعد جی چاہنے لگا ہے کہ آگے کو جھک کر رانوں کے ڈھیلے گوشت پر دھیرے دھیرے مکیاں برساؤں۔ وقفے وقفے سے ماس مٹھیوں میں بھر کر اسے ہڈیوں کے اوپر رگڑتے ہوئے سہلانا بھی بھلا لگ رہا ہے۔

''شی......ناں''

''اب بس کرو۔''

ماں ہاتھ آگے کر کے مجھے روک دینا چاہتی ہے۔

''تم تھک جاؤ گی میری جان۔''

وہ محبت اور شکرگزاری کے جذبات سے کہتی ہے مگر میں اس کی پنڈلیاں سہلاتے رہنا چاہتی ہوں۔

''نہیں ماں، میں نہیں تھکوں گی۔''

میں فوراً کہہ دیتی ہوں اور ناراضی کا ناٹک کرتی ہوں۔

''لگتا ہے ماں، آپ کو مزہ نہیں آ رہا' کیا میرے ہاتھ سخت ہو گئے ہیں؟''

''تمھارے ہاتھ تو روئی کے گالے ہیں میری بیٹی۔ اسی لیے تو کہہ رہی ہوں تم تھک جاؤ گی۔''

جب وہ میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتی ہیں تو میں ماں کی دائیں ہتھیلی میں اوپر کی طرف

اور شہادت کی انگلی کی پہلی پور پر ماس کی گانٹھوں کو صاف محسوس کر لیتی ہوں۔

میرے ہوش سنبھالنے تک ابّا زندہ نہیں رہے تھے۔ ماں ہی میرا سب کچھ تھیں۔ محنت کرتے کرتے اور مجھے پالتے پوستے ان کی ہڈیوں نے کھال چھوڑ دی تھی۔ ایک بار وہ پھسل کر گریں، دائیں ہاتھ سے سہارا لینا چاہا اور کہنی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ یہ ہڈی بعد میں جڑ تو گئی مگر جڑی کچھ ایسی بے ڈھب تھی کہ یہ جوڑ ماس کے اندر سے نہ صرف ابھرا ہوا نظر آتا، دیکھنے پر چبھتا ہوا بھی محسوس ہوتا۔ میں ماں کا دائیاں ہاتھ تھام کر اس جوڑ کے اوپر اپنی پوروں سے مساج کرتی رہتی اور ہر بار پوچھا کرتی کہ انھیں اب بھی اس میں درد تو ہوتا ہوگا؟ ماں ہر بار کھلکھلا کر ہنستی، یوں جیسے مجھے یقین دِلانا چاہتی ہو کہ اُسے کوئی دَرد وَرد نہیں ہوتا۔ تاہم ہر بار اُس ہنسی کے وقفے میں بائیاں ہاتھ اسی ابھرے ہوئے جوڑ پر لے جا کر اسے دبانے لگتی۔ ماں کی بابت سوچتے سوچتے میرا دِل بھر آتا ہے۔ آنکھیں چھلکنے لگتی ہیں اور بے اختیار انھیں پکارتی ہوں:

''ماں جی''

یوں جیسے وہ سامنے ہی بیٹھی ہوں۔ میں ان کی طرف دیکھے بغیر دہراتی ہوں۔

''ماں جی''

اپنی ہی آواز میری سماعتوں سے ٹکراتی ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے، یہ میری آواز نہیں، تارا کی ہے۔

''تارا، میری تارا''

میں چلتے چلتے تارا کی تصویر تک پہنچتی ہوں۔ تارا مسکرا رہی ہے۔

''تارا میرے وجود کا حصہ''

میں اسے جب بھی پکارتی، اسی طرح مسکرا کر میری طرف دیکھتی اور محبت سے ''ماں جی'' کہہ دیا کرتی۔ میں چاہے دس بار پکارتی، وہ دس بار ہی ''ماں جی'' کہتی۔ اور ہر بار محبت سے مسکرا کر دیکھتی۔ وہ جب بھی مسکرا رہی ہوتی، اس کے گال اُوپر کو اُچھلنے لگتے۔

توصیف کے ہنسنے پر بھی اس کے گال اوپر کو اُچھلا کرتے تھے۔

توصیف چلا گیا کہ اسے باہر اچھا چانس ملا تھا۔ وہاں سے لگ بھگ تین برس تک اس کے خط آتے رہے اور ڈالر بھی۔ آخری والے خط میں اس نے لکھا تھا کہ جلد ہی اسے گرین کارڈ ملنے والا ہے۔ بعد میں وہاں سے آنے والوں نے بتایا کہ اس نے وہیں ایک شادی کر لی تھی اور اس کی ایک بچی بھی تھی۔

خیر وہ واپس آجاتا تو میں اسے معاف کر سکتی تھی مگر اس نے اپنی زندگی سے ہمیں کاٹ کر الگ کر دیا تھا۔ میری محبت اسے یاد آئی نہ تارا کی، جو کبھی اس کے وجود کا حصہ تھی۔

’’تارا، میری بچی‘‘

میں تصویر اپنی چھاتی سے لگا لیتی ہوں اور آنکھیں زور سے میچ کر آنسوؤں کو اپنے گالوں پر بہ جانے دیتی ہوں۔ اتنے توقف کے باوجود تصویر چھاتی سے الگ کر کے اوپر اٹھانے تک، تارا کو دیکھنے کے لیے مجھے پانی کی دیوار صاف کرنا پڑتی ہے۔ تارا کے گال اُچھل رہے ہیں۔

اور توصیف کے بھی، مگر اس بار وہ ہنس نہیں رہے، یوں لگتا کسی شدید اذیت میں رو دینا چاہتے ہیں۔

میرا دھیان وہیں بندھا رہا تھا۔

ادھر سے آنے والے عجیب عجیب خبریں دیتے۔ ان کے پھرا کیلے ہو جانے اور اپنے آپ کو تباہ کر لینے کی۔

میں ایک اسکول چلا رہی تھی، پس انداز کیے ہوئے اتنے وسائل تھے کہ میں ان تک پہنچ جاتی۔ مجھے نہ جانے کس برتے پر یقین ہو چلا تھا کہ اگر میں وہاں چلی جاتی تو وہ سب کچھ چھوڑ کر واپس آ جاتے، اپنی زندگی کے پاس، اپنی تارا کے پاس۔ مگر میں نہ جا سکی، اور وہ اپنے آپ کو اذیت دیتے، شراب کی چھینی سے اپنے اندر کو چھلنی کرتے، ایک بار کے اندر مر گئے۔

میں آپ کی اذیت کو سمجھ سکتی ہوں توصیف۔ اور اپنوں سے کترانے کا سبب بھی۔ آپ اپنے بارے میں کسی بھی خبر کو ہم تک پہنچنے سے یوں روک دینا چاہتے ہوں گے کہ ہم مزید دکھی نہ ہوں مگر ساری بری خبریں آپ کے نہ چاہنے کے باوجود، ہم تک پہنچتی رہیں، حتیٰ کہ اپنے سامنے رشین ووڈ کا کا آدھا پیگ رکھے رکھے، لیری کے ننگے کندھے پر سر رکھ کر چپکے سے مر جانے اور وہاں موجود سب کی توجہ پا لینے کی بھی۔

تارا اپنے باپ کے بغیر بڑی ہوتی رہی، بولنا اور چلنا ایک ساتھ سیکھتی رہی، تب تک، توصیف! میں آپ کی جانب سے مایوس نہیں ہوئی تھی۔ میں پوری طرح تو آپ کے مرنے تک مایوس نہیں ہوئی کہ میں ہر بار تارا کے اچھلتے گال چومتی تھی اور آپ کے اچھلتے گال دھیان میں رہتے تھے۔

میں اپنے ہونٹ اس کے گال پر رکھنے کے لیے یخ شیشے پر جما دیتی ہوں اور یخ شیشے کے ادھر ہنسی جہاں تھی وہیں جم جاتی ہے۔

میں پچھلے تین دن سے خاموش پڑے ٹیلی فون کو دیکھتی ہوں، جمعرات سے پہلے یہ نہیں بجے گا۔ میری نظریں پھر تارا کی تصویر کھینچ لیتی ہے۔ وہ گال اچھال ہنسی ہنس رہی ہے مگر میں بہت گہرائی سے ابھر آنے والی بے اطمینانی کو محسوس کر کے بے کل ہو جاتی ہوں۔

''میرا مرد میرا بہت خیال رکھتا ہے۔''

ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں کے کناروں پر صاف شفاف چمکتے موتیوں کے سے قطرے اگ آتے ہیں۔

''وہ بڑی عمر کا مرد ہے نا، بہت خیال رکھتا ہے میرا۔''

وہ میرے جملے کا حوالہ دے کر میری چھاتی پر دکھ کے بوجھ کو کئی گنا بڑھا دیتی ہے۔ تارا کا میاں اس سے عمر میں لگ بھگ دگنا ہوگا مگر واقعی اس کا بہت خیال رکھتا ہے۔ تارا کو اس نے دنیا کی ہر آسائش مہیا کی ہوئی ہے۔ اسی کو وہ گھمانے نکلا ہوا ہے۔ وہ جمعرات سے پہلے واپس نہیں آئیں گے۔

میں واپس بیڈ پر آ کر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ جاتی ہوں' حالاں کہ میں جانتی ہوں کہ اس طرح بیٹھنے سے میری ٹانگیں سن ہو جایا کرتی ہیں۔

میری ٹانگیں یخ بستہ ہونا شروع ہوگئی ہیں۔ میں سارے کمرے میں نظر دوڑاتی ہوں۔ ہر کہیں، چھت کے وسط میں نصب فانوس کے قمقموں کی روشنی گھوم رہی ہے۔

میں نے اپنی خواہش کے مطابق گھر بنوایا تھا۔ اور جب یہ پچیس قمقموں والا فانوس لگ چکا تو سوچا تھا کہ میں اور تارا اس روشن گھر میں ہمیشہ رہیں گے حالاں کہ تارا اپنے جس کلاس فیلو سے محبت کرتی تھی، وہ اسے اپنے بوڑھے والدین کے پاس رکھنا چاہتا تھا۔

میں نے منع کر دیا۔ دوسرا، تیسرا، چوتھا، جو بھی آیا، سب کو منع کرتی رہی۔ وہ پہلے پہل آنے والوں سے لاتعلق رہی۔ پھر جیسے اسے یقین ہو چلا تھا کہ میں کبھی ہاں نہیں کہوں گی۔ وہ ایک لحاظ سے درست تھی۔ مجھے واقعی خدشہ ہو چلا تھا کہ ایک دفعہ کا اقرار مجھے ہمیشہ کے لیے اکیلا کر سکتا تھا۔ وہ چڑ چڑی ہوگئی۔ اتنی کہ بات بے بات میرے ساتھ الجھنے لگتی۔ میں اس کو ساتھ رکھ کر بھی اکیلی ہو رہی تھی۔ اس سب کے باوجود میں اس بوڑھے مرد سے اسے شادی کرنے پر قائل نہ کرتی اگر مجھے موت کی دھمک سنائی نہ دیتی۔ وقت تیزی سے گزر گیا تھا۔ ایک مدت سے تارا کی طلب میں کوئی نہ آ رہا تھا۔ وہ آیا تو میں نے تارا کو یہ کہہ کر منا لیا تھا کہ بڑی عمر کے مرد بہت خیال رکھا کرتے ہیں۔

''بڑی عمر کا مرد''

میں بڑبڑاتی ہوں۔ اپنی سن ہوتی ٹانگوں کو کھینچ کر بستر کے اوپر کرنا چاہتی ہوں مگر کوشش کے باوجود اُوپر کھینچ نہیں پاتی۔ میں بوکھلا جاتی ہوں،

''تو کیا موت میری ٹانگوں سے میرے بدن پر چڑھ رہی ہے؟''

میں سر جھکا کر موت کا چہرہ دیکھنا چاہتی ہوں، میں بہ مشکل آگے کو جھکتی ہوں۔ اُوپر سے برسنے

والی روشنی میرے قدموں میں نہیں ہے۔ میں کچھ اور زور لگاتے ہوئے آگے کو جھولتی ہوں اور ایک لمحے کے لیے عین قدموں کے درمیان نگاہ ڈالنے میں کامیاب ہو جاتی ہوں۔ وہاں جہاں موت کا چہرہ ہوسکتا تھا۔ وہ وہیں ہے... سیاہ... گول... چپڑ چپڑ میری پنڈلیاں چاٹنے والا۔ میں جتنا زور لگا کر آگے کو جھولی تھی اس سے کہیں تیزی سے پیچھے کی سمت گرتی ہوں۔ اتنی سرعت سے گرنے کے دورانیے میں ہی میں یہ بھی جان جاتی ہوں کہ میری پنڈلیاں چاٹنے والی موت تھوتھن جیسی ہے۔

میں پُرسکون رہنے کے لیے ان سب کو یاد کیے جانے کی کوششیں جاری رکھنا چاہتی ہوں جو میری زندگی میں کسی نہ کسی طرح شامل رہے۔ مگر تھوتھن...

یہ بھی تو میری زندگی میں دخیل رہا ہے۔ وہ گھٹنوں کو جکڑ کر اوپر چڑھتا ہے۔ میری رانوں کا ڈھیلا گوشت، یوں لگتا ہے جیسے تن گیا ہے۔

''تھوتھن... بھ...'' نامکمل سسکاری میرے ہونٹوں پر سرسراتی ہے۔

بڑی عمر کا مرد میرے دھیان میں ہے، ہونٹوں کے اُوپر سفید جھولتی مونچھوں والا۔

اعصاب ڈھیلے پڑنے لگتے ہیں۔ یوں، جیسے کہ میں وہاں نہیں ہوں، کہ وہاں تو تارا ہے۔

تھوتھن کی گیلی تھوتھنی سے بچانے کے لیے وہ اپنا بدن سمیٹ لینے کے جتن کرتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے میری انگلیاں میری ہتھیلیوں میں سمٹ رہی ہیں۔

لجلجا اندھیرا رانوں پر گدگدی کرتا ہے۔

اس کی تھوتھنی سے آگے کو جھولتی مونچھیں سانسوں میں رخنے ڈالتی ہیں تو مجھے ابکائی آ جاتی ہے۔

میرے حلق کو چیر کر بہ نکلنے والا گیلا پن میری گردن سے نیچے تک بہتا جا رہا ہے۔ اندھیرا بدن چاٹتا اوپر اُٹھ رہا ہے۔ اندھیرا نہیں لجلجا تھوتھن۔ وہ کلیجا چبانے کے بعد گردن دبوچتا ہے جب کہ میں اندازہ لگانے کے جتن کر رہی ہوں کہ ہم دونوں میں سے کون ہے جو اس کا لقمہ بن رہا ہے۔

☆:☆:☆

ہجرت کا بہی کھاتہ

۔جعفر حسن مبارک۔

آسمان کو سیاہ بادلوں نے اپنے حلقے میں جکڑ رکھا تھا۔ کبھی کبھار بجلی کوندتی۔۔۔ کڑکڑاتی۔۔۔ دہلے ہوئے دِل مزید دہل کر رہ جاتے۔۔۔ باہر گلیاں اور۔۔۔ کہیں سیلاب کا منظر پیش کر رہیں تھیں۔۔۔ بوڑھا اور اس کا جواں سال بیٹا دوکان پر جانے کے لیے تیار تھے۔۔۔ بوڑھے نے اپنے ہاتھ میں چھتری تھام رکھی تھی۔۔۔ اس کا خیال تھا کہ جونہی بارش کی تندی ذرا دم توڑے گی۔۔۔ وہ گھر سے چل دیں گے۔۔۔ موٹر سائیکل کی پچھلی نشست پر بیٹھ کر بوڑھا چھتری تان کر خود اور موٹر سائیکل چلاتے ہوئے بیٹے کے لیے بوندا باندی سے تحفظ حاصل کرنے میں شاید کامیاب رہے اور گھر سے دوکان کا فاصلہ بھی تو پانچ سات منٹ کی ڈرائیور سے زیادہ کا نہیں تھا۔

۔۔۔ بارش ذرا تھمی۔۔۔ بوڑھے نے کھڑکی سے باہر جھانک کر گلی کے منظر نامے پر نگاہ ڈالی تو بے اختیار میٹروپولیٹن کارپوریشن کے نکاسیٔ آب پر متعین عملے کے لیے صلواتیں اس کی زبان پر آ گئیں۔۔۔ سالے نہ جانے فنڈز کہاں لے جاتے ہیں۔۔۔ سیورج سسٹم تو جیسے ہے ہی نہیں۔۔۔ سڑک پر کتا پیشاب کر جائے تو مہینوں جوہڑ بنا رہتا ہے۔۔۔ مجال ہے جو کسی کو پبلک کی پرواہو۔۔۔ معلوم نہیں کیا بنے گا اس شہر کا؟

آپ گھر پہ رہیں ابو۔۔۔ آج میں اکیلا ہی دوکان پر چلا جاتا ہوں۔۔۔ آپ کے لیے مشکل ہوگی۔۔۔ لڑکے نے موسم کی صورتِ حال کا اندازہ کرتے ہوئے پیشکش کی۔۔۔ بوڑھا جیسے کسی نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔ نہیں فیضان۔۔۔ آج ہم دونوں میں سے کوئی بھی نہیں جائے گا۔ دوکان بند رہتی ہے تو۔۔۔ بلا سے رہے۔۔۔

کراچی میں جب بھی کبھی ایسی بارش ہوتی ہے۔۔۔ اگلے دِن اخبار سے سو ڈیڑھ سو آدمی

کے لاپتہ ہوجانے کی اِطلاع ملتی ہے۔۔۔ظاہر ہے انھیں وہ گڑنگل جاتے ہیں جن کے ڈھکنے چوری کر لیے جاتے ہیں۔۔۔اتنے پانی میں کون اندازہ کر سکتا ہے کہ سڑک کے بیچوں بیچ آگے گڑا ہے اور وہ مگرمچھ کی طرح منہ کھولے راہ گیر کا منتظر ہے!۔۔۔

بیسیوں لوگ ایسے ہی حادثات کا شکار ہو جاتے ہیں لہٰذا میں نہیں چاہتا کہ اس بارش میں ہم دونوں میں سے کوئی ایک یا ہم دونوں ہی لاپتہ ہونے والوں میں شامل ہوں۔۔۔'' بیٹا اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا سیاہ ہیلمٹ ایک طرف میز پر رکھتے ہوئے بولا۔۔۔کراچی میں کسی کا لاپتہ ہونا صرف بارش پر ہی تو موقوف نہیں ہے ابو۔۔۔آپ دیکھتے نہیں کہ آئے دِن لوگ لاپتہ ہوتے رہتے ہیں اور پھر ان کی بوری بند لاشیں بھی کہیں نہ کہیں سے برآمد ہوتی رہتی ہیں۔۔۔کہنے کو تو لڑکے نے اپنی روانی میں بات مکمل کر دی مگر بات کرتے ہی اُسے احساس ہوا کہ اُسے اپنے باپ سے یہ بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔۔۔خاص طور پر ''بوری بند لاشوں'' کا ذِکر تو بالکل نہیں کرنا چاہیے تھا۔۔۔وہ جانتا تھا کہ پچھلے تین ماہ اس کے خاندان نے کس عذاب سے گزرتے ہوئے گزارے ہیں۔۔۔ان بوری بند لاشوں نے ان کی زندگی کچھ عرصہ کس طرح جہنم بنائے رکھی ہے اس کا تصوّر ذہن میں لاتے ہی وہ کانپ اُٹھا۔

عبدالودود صدیقی کا خاندان آبائی طور پر الہٰ آباد سے تعلق رکھتا تھا۔ تقسیمِ ہند کے کے تین سال بعد ان کے والدین نے پاکستان ہجرت کی۔۔۔ان کا پہلا پڑاؤ لاہور شہر تھا جہاں ان کا ایک بھائی آج بھی قیام پذیر ہے۔۶۵ء میں جب کراچی کو عروس البلاد اور روشنیوں کا شہر قرار دیا جاتا تھا۔۔۔والد کے انتقال کے بعد اِن روشنیوں کا افسوں عبدالودود کے علاوہ دیگر بھائیوں اور بہنوں کو کراچی کھینچ لایا۔۔۔جب کہ ایک بھائی نے وہیں قیام پذیر رہنے کو ترجیح دی۔۔۔اِن دِنوں عبدالودود آتش جواں تھے۔ یہاں آ کر انھوں نے سبزی منڈی میں باردانے کا کام شروع کیا۔ دِن رات محنت کی اور باردانے کی تجارت میں نام بنانے میں کامیاب ہو گئے۔۔۔

باردانے کے کاروبار میں پچھلا ایک ڈیڑھ سال ان پر بہت بھاری ثابت ہوا۔۔۔اس بھاری پن کی اِبتدا اس وقت ہوئی جب ایک لسانی تنظیم کے رہنما کے ناگہانی قتل کے بعد شہر میں سوگ کی غرض سے کی گئی ہڑتال کے دوران میں بعض شرپسندوں نے بعض اور سرکاری عمارات کے ساتھ ان کی دوکان کو بھی آگ لگادی جس سے دوکان اور دوکان سے ملحق گودام میں کروڑوں کی مالیت کا ملا۔ چند ہی گھنٹوں میں دھویں میں اُڑتا ہوا راکھ ہو گیا۔اس سانحے پر عبدالودود صدیقی دیوالیہ ہو گیا ہوتا مگر غنیمت یہ تھی کہ اس نے اپنے گودام کی انشورنس کروا رکھی تھی۔مگر بدقسمتی سے وہ جنرل انشورنس کمپنی بہت نامعقول ثابت ہوئی۔انشورنس کمپنی سے کلیم اگرچہ اُسے اس کے اصل نقصان سے بہت کم مِلا۔۔۔تاہم وہ اس قابل

ضرور ہوگیا کہ ازسرِنو اپنا کاروبار استوار کر سکے۔۔۔نقصان کا کلیم حاصل کرنے کے عمل نے اس کے چھ کاروباری مہینے ضائع کر دیئے۔۔۔ اسی دوران میں اُس پر یہ اِنکشاف ہوا کہ اس کی دوکان کو آگ۔۔۔اس کے ایک کاروباری حریف نے چند شر پسند نوجوانوں کو خطیر رقم دے کر لگوائی تھی۔۔۔ اس سانحے کی تحقیقات بھی ہوئیں۔۔۔اس ضمن میں بہت سی گرفتاریاں بھی ہوئیں مگر نتیجہ کچھ بھی بر آمد نہ ہوسکا۔۔۔

شہر کراچی کی وہ روشنیاں جن کی کشش اُسے لاہور سے کراچی کھینچ لائی تھی۔۔۔اور جو بدترین حالات میں بھی اس کی اُمنگوں اور تصوّرات میں ہمیشہ روشن رہی تھیں۔مختصر سے عرصے میں آدھی سے زیادہ فیوز ہوچکی تھیں۔ بقیہ آدھی سے بھی کم روشنیوں کی جگمگاہٹ ابھی باقی تھی۔۔۔اسی آس دلاتی ہوجگمگاہٹ کی بنیاد پر ابھی اس نے اپنا باردانے کا یہ کاروبار ازسرِنو استوار کرنے کا آغاز ہی کیا تھا کہ اس پر ایک اور مصیبت نازل ہوگئی۔ایک روز دوپہر کے وقت وہ اپنی دوکان پر گاہکوں میں گھرے بیٹھے تھے کہ اچانک پولیس کی چند گاڑیاں اُن کی دوکان کے سامنے رُکیں۔۔۔اور ایک سریع الحرکت۔۔۔کمانڈو ایکشن کے ساتھ۔۔۔وردی والوں نے اسلحہ تان کر اپنی حراست میں لے لیا۔۔۔انھوں نے بہتیرا پوچھا ماجرا کیا ہے ہمیں کیوں حراست میں لیا جا رہا ہے جواب مِلا یہ تو پولیس سٹیشن چل کر ہی پتہ چلے گا۔۔۔ دوکان کو تالا لگا کر چابیاں بھی قبضے میں لے لی گئیں۔۔۔تھانے پہنچ کر ان پر الزام لگایا گیا کہ شہر کے مختلف علاقوں میں جو بوری بند لاشیں بر آمد ہو رہی ہیں ان میں سے بیشتر لاشوں کی بوریوں پر آپ کی دوکان کا ٹریڈ مارک پرنٹڈ ہے۔۔۔جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ شر پسندوں سے رابطے میں ہیں اور اس عمل میں اِستعمال کے لیے بوریاں آپ ہی انھیں فراہم کر رہے ہیں۔۔۔عبدالودود صدیقی نے انھیں بتایا کہ وہ تقریباً پینتالیس سال سے اس ٹریڈ مارک کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ان کی دوکان سے فروخت ہونے والے باردانہ پر یہ ٹریڈ مارک چسپاں ہوتا ہے۔اوران بوریون کی سپلائی وہ پاکستان بھر میں دیتے ہیں۔ ہزاروں لوگ ہم سے بوریاں خرید کر لے جاتے ہیں ان میں سے سب کو ظاہر ہے نہ تو ہم جانتے ہیں اور نہ جان سکتے ہیں۔۔۔اگر کہیں ان بوریوں کا کوئی ناپسندیدہ استعمال ہو رہا ہے تو اس کے ذمہ دار ہم تو نہیں ہیں۔۔۔عبدالودود صدیقی صاحب کو اس کا جواب یہ مِلا کہ۔۔۔ یہ تو تفتیش کے بعد ہی پتہ چلے گا کہ بوریاں آپ خود پرووائیڈ کرتے ہیں۔۔۔یا کسی اور ذریعے سے آپ سے لے جائی جاتی ہیں؟ اور آپ کسی کو جانتے بھی ہیں یا نہیں؟

تقریباً ایک ماہ تک جب تک کہ تفتیشی حضرات کو تین لاکھ روپے فی کس کے حساب سے ادائیگی نہیں کر دی گئی۔تفتیش جاری رہی اور وہ حوالات کے حوالے رہے۔۔۔لیکن اس ایک ماہ کے

دوران میں انھوں نے جس قسم کی تفتیش برداشت کی۔۔۔ وہ کسی طرح بھی کسی سزا سے کم نہ تھی۔ اس تفتیش نے عبدالودود صدیقی کے تصوّر میں شہر کراچی کی وہ رہی سہی روشنیاں بھی گل کر دیں جو دوکان کو آگ لگنے کے بعد روشن رہ گئی تھیں۔۔۔ عبدالودود کے لیے اس کی اُمیدوں اور آرزوؤں کا مرکز یہ شہر تقریباً اندھیر ہو چکا تھا۔۔۔ مگر اس کا یہ اندھیرا ابھی اس کے لیے اِتنا گہرا نہیں ہوا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی دینے سے اِنکار کر دے۔

عبدالودود صدیقی کے لیے یہ اندھیرا اس دِن کی طوفانی بارش کے بعد گہرا ہونا شروع ہوا جس دِن انھوں نے دوکان پر نہ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔۔۔

غالباً جمعرات کا دِن تھا کیونکہ اس دِن فیضان نے اپنے ایک دوست کے ساتھ عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر حاضری دینے کا پروگرام طے کر رکھا تھا۔۔۔ سہ پہر کے وقت مزار پر روانگی سے قبل ہی فیضان کو ایک اجنبی نمبر سے ایک کال موصول ہوئی۔۔۔ کالر نے اپنے آپ کو فیضان کا ایک خیر خواہ بتاتے ہوئے اُسے مطلع کیا کہ اس کے علاقے میں سرگرمِ عمل ٹارگٹ کلرز کی فہرست میں اس کا نام بھی شامل ہو چکا ہے۔ اس لیے وہ کچھ عرصہ کے لیے روپوش ہو جائے تو اس کے حق میں بہتر ہوگا۔۔۔ اس اطلاع کے ساتھ ہی فون بند کر دیا گیا۔۔۔ جوابی کال پر وہ نمبر بند مِلا فیضان نے اس صورتِ حال سے بڑے صدیقی صاحب کو فوراً مطلع کیا، جنھوں نے اپنے وسائل سے اس نمبر کی رجسٹریشن کا پتہ کروانا چاہا مگر معلوم ہوا کہ یہ ایک نان رجسٹرڈ نمبر ہے۔

عبدالودود صدیقی کا خیال تھا فیضان کے کسی دوست نے اُسے پریشان کرنے کے لیے ایسی شرارت کی ہے، وگرنہ اس کے کسی کی ٹارگٹ لسٹ پر آنے کا بظاہر کوئی جواز نہیں ہے؟ کیونکہ بھتہ لینے والوں کو وہ بھتہ اور چندہ لینے والوں کو وہ چندہ دیتے ہیں۔۔۔ فرقہ ورانہ سرگرمیوں سے انھیں کوئی سروکار نہ ہے۔ بلدیاتی یا ملکی کسی قسم کی سیاست سے انھیں کوئی ایسا دخل نہ ہے کہ کسی کی سیاسی بالادستی کے لیے خطرہ قرار دیے جاسکیں۔۔۔ نہ کسی کے ساتھ کوئی لین دین کا تنازعہ ہے۔۔۔ تو آخر کوئی کسی عام آدمی کو بلاوجہ کسی ہٹ لسٹ میں کیوں شامل کرے گا؟

اگرچہ تمام استدلال فون پر دی گئی وارننگ یا اطلاع کی تردید میں جاتا تھا اس کے باوجود عبدالودود صدیقی نے بہتر سمجھا کہ احتیاط کی جائے۔۔۔ اس روز سے فیضان کا دوکان پر جانا بند کر دیا گیا۔ بہت ہوتا تو وہ گھر کی گلی کی نکڑ کے قریب واقع دوکان تک گھریلو سودا سلف کی خریداری کے لیے چلا جاتا۔ وہاں زیادہ دیر ٹھہرنے کی بجائے اس کی کوشش ہوتی کہ فوراً گھر کی پناہ میں واپس چلا جائے۔

ٹارگٹ کلنگ کے حوالہ سے کراچی کی جو صورتِ حال بن چکی تھی اس کے پورے شہر کو دہلا کر

رکھ دیا تھا۔۔۔کسی کو کچھ معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ مرنے والا کیوں مر رہا ہے اور مارنے والے اُسے کیوں قتل کر رہے ہیں مگر لاشیں تھیں کہ ہر گلی محلے میں گرتی چلی جا رہی تھیں۔۔۔نامعلوم قاتل شہر میں دندناتے پھر رہے تھے۔۔۔اور کوئی ایسا نہیں تھا کہ اُن کے چہروں سے نقاب ہی نوچ سکے۔۔۔ان حالات میں عبدالودود صدیقی نے بہتر سمجھا کہ فیضان کے گھر سے باہر نکلنے پر مکمل طور پر پابندی لگا دے۔ فیضان سارا سارا دِن ٹی وی کے سامنے بیٹھا رہتا۔۔۔جس دِن ایک پرائیویٹ ٹی وی چینل سے یہ خبر نشر ہوئی کہ پاکستان میں ٹارگٹ کلنگ میں مرنے والوں کی تعداد خود کش دھماکوں میں مرنے والوں سے زیادہ ہوگئی ہے تو اس کا دِل بیٹھ گیا۔اسے لگا جیسے وہ بھی ان مرنے والوں میں شامل ہو چکا ہے۔

بیٹے سے بوڑھے باپ کی مشقت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ پوتے پوتی کو سکول چھوڑنا۔۔۔گھر کا سودا سلف لانا صبح سے شام تک دوکانداری کی ذمہ داریاں۔۔۔اس نے بار ہا باپ سے کہا کہ کچھ ہونے والا نہیں ہے۔ جو کچھ ہوتا ہے خدا کی رضا سے ہوتا ہے۔اس طرح گھر میں چھپے رہنے سے حالات کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا مگر عبدالودود کی احتیاط پسند طبیعت نے اُسے سختی سے منع کر دیا کہ جب تک وہ اجازت نہ دے۔گھر سے قدم بھی باہر نہ نکالے بلکہ کسی کو یہ بھی پتہ نہیں چلنا چاہیے کہ وہ گھر پر ہی موجود ہے۔

سخت احتیاط کے انھی دِنوں میں سے ایک دِن صبح دس بجے کے قریب فیضان کا بہنوئی اُن کے ہاں آیا۔۔۔وہ اہلِ خانہ کی خیر و عافیت دریافت کرنے آیا تھا۔۔۔کہ اچانک اُسے یاد آیا کہ ساتھ کے محلے میں اُسے کاروباری ضرورت کے تحت کسی دوست سے ملنا ہے۔۔۔اس نے فیضان سے کہا یار تم تو گھر پر ہی ہو ذرا اپنی موٹر سائیکل دو میں ساتھ کے محلے سے ہو کر آدھ گھنٹے میں واپس آتا ہوں۔۔۔وہ گھر سے نکل رہا تھا کہ فیضان نے اپنا سیاہ رنگ کا ہیلمٹ اُسے پکڑاتے ہوئے کہا بھائی جان ہمارے علاقے میں ہیلمٹ کے بغیر موٹر سائیکلنگ بہت بڑا رِسک ہے یہ بھی لیتے جائیے۔۔۔اس کے بہنوئی نے ہیلمٹ سَر پر رکھا۔۔۔موٹر سائیکل کو کک لگائی اور منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو گیا۔۔۔اُسے گھر سے باہر نکلتے دیکھ کر گلی کی نکڑ پر پان سگریٹ کے کھوکھے کے پاس کھڑے دو نوجوانوں میں سے ایک بڑبڑایا۔ اِتنے دِنوں بعد آج نکلا ہے سالا۔۔۔تو نے بہت انتظار کروایا رے؟ اس نے فوراً موٹر سائیکل سٹارٹ کی دوسرا اس کے پیچھے بیٹھا اور دونوں سیاہ ہیلمٹ کی نشانی سے اپنی نگاہیں چپکائے اس کے تعاقب میں روانہ ہو گئے۔۔۔دو تین منٹ بعد ہی علاقے میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ گونجی اور کراچی کا ایک اور نوجوان لقمۂ اجل بن گیا۔۔۔ایمبولینس ابھی ہسپتال کی حدود میں پہنچی نہیں تھی کہ وہ دم توڑ چکا تھا۔۔۔ فیضان جس وقت اپنے بہنوئی کی واپسی کی توقع کر رہا تھا۔۔۔اس وقت اس کی موت کی خبر آ گئی۔۔۔گھر میں کہرام مچ گیا۔۔۔فیضان کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا۔۔۔کہ خود اس کے دھوکے

میں اس کے بہنوئی کو نشانہ بنایا گیا ہے۔۔۔اگر وہ فیضان کی موٹر سائیکل پر سوار نہ ہوتا اور فیضان کے سیاہ ہیلمٹ سے اِس کا چہرہ نہ چھپا ہوا ہوتا تو ہوسکتا تھا کہ اس کی جان بچ جاتی۔۔۔آناً فاناً بیٹی کا بیوہ ہو جانا۔۔۔ایسا سانحہ تھا کہ جس نے صدیقی فیملی کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔۔۔اُوپر سے بہنوئی کی تدفین کے بعد جب فیضان ایک اورعزیز کی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر واپس آ رہا تھا تو ایک نامعلوم ڈالے نے موٹر سائیکل کو پیچھے سے اِتنی زور سے ٹکر ماری کہ اُڑتے ہوئے فٹ پاتھ پر دُور جا گرا۔۔۔جب کہ موٹر سائیکل پوری طرح کچلی گئی۔۔۔''ڈالے والوں'' کا خیال ہوگا کہ انھوں نے اپنے ٹارگٹ کا کام تمام کر دیا ہے مگر فیضان کی خوش قسمتی رہی کہ معاملہ ہلکی پھلکی چوٹوں پر ہی ٹل گیا۔۔۔

عبدالودود صدیقی اور فیضان جانتے تھے کہ یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا بلکہ دیدہ و دانستہ فیضان کی جان لینے کے لیے یہ طریق کار اختیار کیا گیا تھا۔۔۔اس واقعے نے ان کی پریشانیوں میں اور اضافہ کر دیا۔

یکے بعد دیگرے رُونما ہونے والے بدترین واقعات نے فیضان کو اِتنا خوفزدہ اور زود حس بنا دیا تھا کہ گھر کی ڈور بیل کی آواز سنتے ہی لگتا کہ جیسے اس کا دِل سینے سے باہر جا پڑے گا۔اُسے یہی گمان ہوتا کہ کسی بھی وقت درندے دندناتے ہوئے گھر میں گھس آئیں گے۔خود کار آتشیں اسلحے کی لبلبی دبائیں گے اور افرادِ خانہ کو لہو میں نہلا کر اطمینان سے چلتے بنیں گے۔وہ اس خوف سے جس قدر جان چھڑانا چاہتا یہ خوف اِتنا ہی زیادہ اس کی جان کو آتا ایسے میں درد کی ایک تیز لہر جیسے اس کے دِل کو چیرتے ہوئے نکل جاتی۔۔۔ساری ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے وہ یہی سوچتے ہوتا دینا کہ آخر اس کا کوئی ایسا دُشمن کیونکر ہوسکتا ہے کہ جس کے لیے فیضان کو دُنیا سے اُٹھانا ناگزیر بن چکا ہے۔اس عالم میں وہ اپنی زندگی کے منفی واقعات پرغور وفکر شروع کر دیتا کہ شاید اس دُشمنی کے تانے بانے کا سراغ کہیں سے مِل پائے اُسے خیال آتا کہ کالج لائف میں وہ سٹوڈنٹس تنظیم کا سرگرم رُکن ہوا کرتا تھا۔۔۔کاروبار میں باقاعدہ عمل دخل سے قبل وہ لسانی بنیادوں پر استوار ہونے والی اپنی پسندیدہ سیاسی تنظیم کے لیے ایک سرگرم کارکن کے طور پر کردار سرانجام دیتا رہا تھا۔اپنی کاروباری مجبوریوں کی بنا پر اب چونکہ وہ ایسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا روادار نہ رہا تھا اس لیے اس نے سوچا کہ ہو نہ ہو یہی تنظیم یہ گمان کرتے ہوئے کہ اس نے اپنی وفاداریاں کسی اور مخالف تنظیم کے پلڑے میں ڈال دی ہیں،اس کی دُشمن بن گئی ہو۔۔۔پچھلی عید البقر پر اس نے قربانی کی کھالیں اکٹھی کرنے والی ایک جماعت کے کارکنوں کو دُنبے کی کھال فراہم کرنے سے اِنکار کر دیا تھا۔۔۔کہیں سب کارروائی انھی لوگوں کا شاخسانہ ہی نہ ہو۔۔۔گلی میں منعقدہ بہ سلسلہ عید میلاد النبی ﷺ ،نعت خوانی کے ایک پروگرام میں انتظامی کمیٹی کے اراکین کے ہمراہ نشے کی ترنگ میں ہڑبونگ مچانے والے دو لڑکوں کی ٹھکائی کرتے ہوئے انھیں پنڈال سے باہر

کرنے والوں میں وہ بھی شامل رہا تھا۔ کہیں یہ انھی لڑکوں یا ان کے سرپرستوں کی جوابی انتقامی کارروائی نہ ہو؟۔۔۔ ڈیڑھ دو سال قبل محلے کی مین سڑک پر لائٹیں نصب کر کے فلڈ لائٹ ٹیپ بال ٹورنامنٹ کے ایک میچ کی امپائرنگ کرتے ہوئے اس کے بعض فیصلوں پر ایک ٹیم نے شدید احتجاج کیا تھا اور لڑائی جھگڑے پر اُتر آئی تھی۔۔۔ اور اُسے اپنی ہار کا ذمہ دار قرار دیتی رہی تھی۔ کہیں یہ اُسی ٹیم کا کیا دھرا نہ ہو؟ لسانی تعصّبات کے حوالہ سے اس کی فیملی کا دامن صاف رہا تھا۔ پنجابی، سندھی، پٹھان تقریباً سبھی کمیونٹیز کے لوگوں سے ان کے بہت اچھے کاروباری تعلقات قائم تھے۔ شادی غمی پر بھی آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اچھے برے ہر قسم کے حالات میں ان کے مددگار اور ساجھی ہونے کی وجہ سے کس طرح ممکن تھا کہ نسلی بنیاد پر قائم کوئی تنظیم اُسے اپنی ہٹ لسٹ پر رکھ لے! اس کا کسی گینگ سے بھی کسی قسم کا دُور کا واسطہ بھی نہ رہا تھا کہ وہ گینگ وار کا کوئی لازمی نتیجہ سمجھ کر اس صورتِ حال کو جواز دینے کی کوشش کر پاتا۔ کاروباری سطح پر بھی صورتِ حال یہ تھی کہ اب وہ کسی کے حریف نہیں رہے تھے، ان کی دوکان اور گودام کی آتش زنی کے واقعے کے بعد کے دورانیے میں ان کے سابقہ کاروباری حریف ان سے معاشی طور پر اتنا آگے نکل گئے تھے کہ اب انھیں پیچھے مڑ کے دیکھنے کی ضرورت ہی نہ رہی تھی۔ لہٰذا کاروباری مسابقت کے حوالہ سے اب وہ اس قابل نہیں رہے تھے کہ ان کے کسی کاروباری حریف کو انھیں ٹارگٹ بنانے سے کوئی فائدہ مِل سکتا۔ غرض فیضان اور اس کے والد کے شب و روز اسی نوع کے مفروضات پر غور و فکر کرنے میں بسر ہو رہے تھے دونوں کی جسمانی صحت تیزی سے گرتی چلی جا رہی تھی تاہم بوڑھا آدمی جوان بیٹے کے مقابلے میں زیادہ سخت جان دِکھائی پڑتا تھا کہ ابھی تک اپنے حواس سنبھالے ہوئے تھا۔ جب کہ فیضان کو محسوس ہو رہا تھا کہ دِل کا مریض ہوتا چلا جا رہا ہے۔۔۔ اور اب اُسے دِل کے کسی اچھی ڈاکٹر سے کنسلٹنٹ کرنے اور اپنا چیک اَپ کروانے کی اَشد ضرورت درپیش تھی۔

فیضان اپنے والد کے گھر آنے پر شام کو دِل کے دغا دینے کے خدشات کی بابت بات چیت کر رہا تھا کہ لاہور میں مقیم اس کے حقیقی چچا حفیظ صدیقی کا فون آ گیا۔۔۔ وہ بڑے بھائی کے داماد کی رحلت پر اس سے تعزیت کرنا چاہتے تھے۔ عبدالودود صدیقی سے بات کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ بیرونِ ملک ہونے کی وجہ سے اندوہ و غم کی اس گھڑی میں شرکت سے قاصر رہا ہے۔۔۔ اس نے ان سے دیگر احوال کی بابت دریافت کیا تو۔۔۔ عبدالودود صدیقی جو بہت دِنوں سے اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھے۔۔۔ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔۔۔

حفیظ صدیقی نے بھائی کو درپیش مسائل سنے تو اُسے بھی بے انتہا دُکھ پہنچا۔۔۔ اُس نے بڑے بھائی کو مشورہ دیا۔۔۔ جان ہے تو جہان ہے۔۔۔ اس لیے وہ کراچی میں اپنے مفادات سمیٹ

کر جلد سے جلد لاہور اس کے پاس شفٹ ہو جائے۔۔۔وہ ان کی رہائش کا بندوبست کرنے کے ساتھ ساتھ۔۔۔فیضان کے لیے ایسا کاروباری پوائنٹ بھی دیکھ رکھے گا جہاں انھیں اپنا باردانے کا کاروبار چلانے اور مستحکم کرنے میں زیادہ دِقت نہ پیش آئے۔ چھوٹے بھائی سے بات چیت نے عبدالودود صدیقی کو اپنے خاندان کے تحفظ کا ایک راستہ سجھا دیا۔۔۔وگرنہ وہ تو اپنے بچاؤ کی کسی بھی ممکنہ صورتِ حال سے قطعی مایوس ہو چکا تھا۔۔۔کراچی کے مزید گھرے ہوتے ہوئے اندھیروں کے عالم میں اُسے روشنی کی ایک کرن دِکھائی دی مگر یہ کرن اُسے لاہور میں دِکھائی دی تھی جیسے وہ کچھ دہائی اُسے فوری طور پر کراچی سے ہجرت کر جانے کی ہدایت دے رہی تھی۔۔۔اور اس کرن کی جوت اب عبدالودود صدیقی نے اپنی بجھتی ہوئی آنکھوں میں جگا لی تھی۔ اُسی رات اُس نے اہلیہ، بہو اور بیٹیوں کو اپنے لاہور منتقل ہونے کے فیصلے سے آگاہ کرتے ہوئے ان کی رائے دریافت کی تو حالات کے پیشِ نظر سب کو یہی صورت سب سی بہتر دِکھائی دی۔

بہت عرصہ تک حفیظ صدیقی کو اس کے کراچی اور حیدر آباد میں قیام پذیر قریبی رِشتہ دار اس بنا پر چغد اور احمق خیال کرتے رہے کہ اس نے ڈار سے بچھڑنے والی کونج کی طرح ڈار سے بچھڑ کر اپنی عاقبت خراب کر لی ہے اور دیگر بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ کراچی شفٹ ہونے سے اِنکار کر دیا ہے۔ حفیظ صدیقی کی شادی اگر چہ اُردو سپیکنگ فیملی ہی میں سرانجام پائی تھی اس کے باوجود ثقافتی سطح پر انھیں ایک طرح سے ملیچھ خیال کیا جاتا رہا۔ اس کے بچوں۔۔۔گھر کے ماحول۔۔۔زبان کے شین قاف کی بنیاد پر طنزیہ جملے کسے جاتے رہے۔ انھیں سماجی لحاظ سے پست رُتبہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی رہی۔ بیس پچیس سال تک شاید ہی اُن کا کوئی عزیز ایسا ہو جس نے کبھی کسی مشکل میں اس کی خبر گیری کرنے کی ضرورت محسوس کی ہو اور تو اور اس کے حقیقی بھائیوں اور بہنوں کے خاندان انھیں اس طرح نظر انداز کیے رہے جیسے حفیظ صدیقی کی حیثیت ان کے دُور پار کے کسی بھولے بسرے نے تعلق دار کی ہو۔۔۔

حفیظ صدیقی تمام عمر محکمہ تعلیم سے وابستہ رہے جب کہ ان کے صاحبزادگان اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد کاروبار سے منسلک ہو گئے۔ اپنی خداداد صلاحیت کی بدولت جلد ہی کاروباری سطح پر اس مقام پر پہنچ گئے کہ جس کا تصوّر ہی کیا جا سکتا ہے۔ جونہی حفیظ صدیقی کا ایک صاحبزادہ ایک Key Post جاب کرتے کرتے ایک چھوٹے سے پیداواری یونٹ کا مالک بنا۔ دوسرا صاحبزادہ امپورٹ ایکسپورٹ کی ایک فرم کرتے ہوئے اُسے ترقی کی راہ پر چلانے میں کامیاب ہوا۔۔۔تیسرا صاحبزادہ۔۔۔ایک ملٹی نیشنل کمپنی کے ساتھ وابستہ ہو کر امریکہ سدھارا تو۔۔۔ان کے کراچی کے رِشتہ داروں کو احساس ہوا کہ حفیظ صدیقی کے بغیر تو ان کی زندگی بنجر اور ویران تھی۔ ان کے بیشتر رِشتہ داروں نے ان کے صاحبزادوں

کے ساتھ اپنے اپنی بیٹیوں کے ناتے طے کرنے کی پیشکش بھی کی مگر۔۔۔حفیظ صدیقی نے اس معاملے میں اپنے بیٹوں کی خواہشات کو مدِنظر رکھا اور اُن کی شادیاں وہیں طے کی جہاں وہ چاہتے تھے۔ اتفاق سے ان کے تینوں بیٹوں کے سسرالیوں کا تعلق بھی لاہور کے آس پاس ہی کے شہروں سے تھا۔

حفیظ صدیقی ہر سال ایک دو ماہ امریکہ میں مقیم اپنے صاحبزادے کے ساتھ گزارتا جب کہ بقیہ مہینے وہ اپنے پوتے پوتیوں کے ساتھ لاہور میں گزارنے کو ترجیح دیتا۔۔۔عزیز داری کی ایک بہت تعداد کراچی مقیم ہونے کے باوجود۔۔۔کبھی سالوں بعد ہی اُسے کراچی جانے کا اتفاق ہوتا۔۔۔تاہم فون پر ہر کسی سے اس کی صاحب ملامت ہوتی رہتی۔۔۔خاندانی سطح پر اگرچہ عارضی میں اُسے اپنے بڑے بھائی عبدالودود صدیقی سے کبھی دُور نہ ہونے والے کچھ گلے رہے تھے مگر اس وقت وہ اس خیال سے خوش تھا کہ ان کے بھائی کا مستقل قیام بہت جلد لاہور میں ہی کہیں ہوگا جس سے انھیں اپنے بھائی کے ساتھ بہت سا وقت بتانے کا موقع مِل جائے گا۔۔۔حفیظ صدیقی نہیں جانتا تھا کہ آنے والے وقت میں قدرت کو کیا منظور ہے۔

عبدالودود صدیقی جو اپنے آپ کو ایک ایسے مہاجر پرندے سے تشبیہ دیا کرتا جو بھی واپس نہیں لوٹتا۔۔۔ٹوٹے پروں کے ساتھ، اپنے بیٹے فیضان کو صبح کی فلائٹ سے لاہور بھجوانے کی تیاری کر رہا تھا۔۔۔اب وہ فیضان کو ان امور کی بابت ہدایات جاری کر رہا تھا جو اُسے لاہور پہنچ کر سرانجام دینے تھے۔۔۔صبح کے چھ بجے چکے تھے۔۔۔ایئر پورٹ کے لیے ایک کیب منگوائی جا چکی تھی۔۔۔عبدالودود چاہتا تھا کہ اپنے بیٹے کو خود ایئر پورٹ پر چھوڑ کر آئے مگر فیضان نے اس تردّد سے انھیں منع کر دیا۔۔۔ اور کہا کہ یہ کونسا میرا پہلا فضائی سفر ہے۔۔۔بیٹے کو ٹیکسی پر سوار ہوتے دیکھ کر نہ جانے کیوں باپ کا دِل بیٹھا چلا جا رہا تھا۔۔۔

ایئر پورٹ جانے کے لیے ٹیکسی ابھی ان کے علاقے سے نکلی ہی تھی، کہ فیضان۔۔۔ جو اِردگرد کی صورتِ حال سے چوکنّا تھا۔۔۔کو محسوس ہوا کہ دونو جوان موٹر سائیکل پر گاڑی کا پیچھا کر رہے ہیں۔۔۔اس کی چھٹی حس اُسے تنبیہ کر رہی تھی کہ ہو نہ ہو موٹر سائیکل سواروں کی نیت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔۔۔موٹر سائیکل پر دو سواریوں کی پابندی کے باوجود یہ نوجوان اگر اس دھڑلے سے ڈبل سواری کا خطرہ مول لیئے ہوئے تھے تو ایسا جوکھم اُٹھانے میں ان کے مقاصد کچھ نیک دِکھائی نہیں دیتے تھے۔ فیضان نے ٹیکسی ڈرائیور جو ایک پختون نوجوان تھا، سے اپنے خدشات کا اظہار کیا تو وہ بھی چوکنّا ہو گیا۔۔۔کیونکہ شہر میں حال ہی میں پختون قومیّت کے ٹیکسی ڈرائیوروں پر بعض علاقوں میں حملے کیے جانے کے واقعات رُونما ہو چکے تھے۔۔۔ڈرائیور جانتا تھا کہ۔۔۔خطرے کی حدود سے باہر نکلنے کے

لیے اُسے ہر حال میں اس ذیلی سڑک سے مین روڈ پر پہنچنا ہوگا۔۔۔وہ خوب جانتا تھا کہ مین روڈ کی چورنگی پر پولیس موجود ہوگی۔اس لیے اُس چورنگی پر پہنچنے سے پہلے پہلے موٹر سائیکل کے ڈبل سواران کا تعاقب ترک کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔۔۔ڈرائیور نے ٹیکسی کی رفتار تیز کر دی۔۔۔موٹر سائیکل سوار بھی غالباً جانتے تھے کہ انھیں اپنی کارروائی ٹیکسی کے چورنگی پر پہنچنے سے پہلے پہلے سرانجام دینا ہوگی لہٰذا وہ بھی انتہائی رفتار کے ساتھ ٹیکسی کے قریب ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔

اب فیضان کو موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھے نوجوان کے ہاتھ میں لہراتا ہوا آتشیں اسلحہ صاف دِکھائی دے رہا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ٹیکسی پر فائرنگ شروع ہوگئی۔۔۔ڈرائیور حتی المقدور آتشیں اسلحہ کی پہنچ سے اِتنی دُوری کہ جس سے انھیں کوئی نقصان نہ پہنچ سکے بنائے رکھنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔۔۔اسی اثنا میں گولی ٹیکسی کے پچھلے ٹائر میں پیوست ہوگئی اور ایک دھماکے سے ٹائر برسٹ ہو گیا۔ ٹیکسی کی رفتار اتنی تیز تھی کہ اب ڈرائیور کے لیے اُسے کنٹرول کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ڈرائیور اگر اس عالم میں چابک دستی کا مظاہرہ نہ کرتا تو عین ممکن تھا کہ گاڑی اُلٹ جاتی۔۔۔ٹائر برسٹ ہو جانے کی وجہ سے گاڑی توازن سے محروم ہو چکی تھی نتیجتاً ڈرائیور کو گاڑی کنٹرول رکھنے کے لیے اس کی رفتار آہستہ کرنی پڑی۔۔۔موٹر سائیکل پر سوار نشانہ باز گاڑی کے زیادہ سے زیادہ قریب ہوتے چلے جا رہے تھے۔۔۔ انھیں معلوم تھا کہ جلد ہی وہ گاڑی کو جالیں گے۔۔۔اس لیے اب وہ اس پر فائرنگ کرنے میں اپنی بُلٹس ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔۔۔

فیضان نے محسوس کیا کہ گاڑی کی رفتار اِتنی آہستہ ہو چکی تھی کہ دروازہ کھول کر اس میں سے چھلانگ لگا کر عافیت کی تلاش میں بھاگ جانے کا خطرہ مول لیا جا سکتا تھا۔گاڑی کے برابر میں داہنی سمت جونہی وہ موٹر سائیکل نمودار ہوئی فیضان نے بائیں طرف کا دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگا دی۔۔۔چند لمحوں میں سنبھل کر فیضان نے جدھر منہ تھا ادھر دوڑ لگا دی۔۔۔موٹر سائیکل سواروں کو۔۔۔جو غالباً ٹیکسی روک کے اس کے سواروں کو نشانہ بنانے کا ارادہ رکھے ہوئے تھے،صورتِ حال کا اندازہ کرنے میں چند لمحے لگے۔۔۔ان چند لمحوں کی مہلت میں فیضان ان سے اِتنا فاصلہ ضرور بنا چکا تھا کہ انھوں نے موٹر سائیکل موڑ کر اس کا پیچھا کرنے کی بجائے وہیں موٹر سائیکل روک کر اُسے نشانہ بنانے کی کوشش میں اندھا دُھند فائرنگ شروع کر دی۔اِدھر اُدھر اُڑتی مٹی اور کنکر فیضان کو بتا رہے تھے کہ ابھی وہ فائرنگ رینج سے باہر نہیں نکلا۔۔۔گولیوں کی بوچھاڑ میں وہ آؤ تاؤ دیکھے بغیر مسلسل بھاگتا چلا جا رہا تھا۔۔۔یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ کوئی گولی اُسے چھوتے ہوئے نہیں گزری تھی۔۔۔اس نے سامنے آنے والی پہلی گلی کا موڑ مڑتے ہوئے اپنے دُشمنوں پر نگاہ کی تو پایا کہ وہ اپنی ناکام فائرنگ کے

نتیجے سے مایوس ہوکر موٹر سائیکل پر دوبارہ اس کا پیچھا کرنے کے لیے اپنی نشستیں سنبھال رہے ہیں۔۔۔ فیضان کی حالت بہت بُری تھی۔ وہ بُری طرح کانپ اور ہانپ رہا تھا مگر موت کا خوف اُسے ایڑ پر ایڑ لگائے چلا جا رہا تھا اُسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کتنی گلیاں کس طرف کو مڑ کر کہاں پہنچ چکا ہے۔ اس کے احساسات کو موصول ہونے والا اس کا آخری سگنل یہ تھا کہ وہ بھاگتے بھاگتے چکرا کر کہیں گر پڑا ہے۔

بہت سے لوگ فیضان کے اِردگرد اکٹھے تھے۔۔۔ وہ بے ہوش تھا اور پسینے سے اس کا لباس تر ہو چکا تھا۔۔۔ نہ جانے کس نے ایمبولینس سروس کو فون کر دیا تھا کہ چند منٹ بعد ہی اُسے قریبی ہسپتال پہنچا دیا گیا۔۔۔

عبدالودود صدیقی کے موبائل فون کی گھنٹی بجی تو وہ سمجھا کہ فیضان ایئرپورٹ بخیریت پہنچنے کے بعد اُسے مطلع کرنا چاہتا ہے کہ وہ لاہور روانہ ہو رہا ہے مگر۔۔۔ یہ تو کوئی اور ہی تھا۔۔۔ دوسری طرف پوچھا گیا کون؟۔۔۔

عبدالودود صدیقی!

میں اس کا باپ ہوں۔۔۔ آپ فیضاں صدیقی کے کیا لگتے ہیں؟

صدیقی صاحب مجھے معاف کر دیجیے گا۔۔۔ میری بدقسمتی ہے کہ پیشہ ورانہ طور پر بسا اوقات ناخوشگوار بلکہ انتہائی رُوح فرسا پیغامات متعلقین تک پہنچانے کا تکلیف دہ فرض ادا کرنا پڑتا ہے۔۔۔ اِبتدائی گفتگو کے بعد وہ اپنا نام اور اپنے متعلقہ ہسپتال کا نام بتانے میں اتنی دیر لے رہا تھا کہ عبدالودود صدیقی کو کوفت آمیز تشویش ہونے لگی تھی۔۔۔ آخر اس سے رہا نہیں گیا اور بولا ''بھائی۔۔۔ اب جو بات آپ بتانا چاہتے ہیں وہ بلا تکلف بتا دیجیے۔ میں ہر قسم کی بُری خبر سننے کے لیے تیار ہوں۔۔۔''

جواباً اُسے جو خبر سنائی گئی۔۔۔ اس کے احوال سے معلوم ہوا کہ وہ اُسے سننے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔۔۔ جب اُسے تفصیلاً بتایا گیا کہ آدھ گھنٹے پہلے فیضان صدیقی نام کا ایک مریض شدید قسم کے ہارٹ اٹیک کی بنا پر بے ہوشی کی حالت میں ایمرجنسی وارڈ میں لایا گیا تھا۔لیکن تمامتر کوششوں کے باوجود اُسے بچایا نہیں جا سکا۔۔۔ ہسپتال کے نمائندے کی طرف سے نہ جانے اور کیا کیا کہا جاتا رہا۔۔۔عبدالودود صدیقی کے اعصاب بیٹے کی موت کا سنتے ہی سُن ہو کر رہ گئے اور اس کا بدن بھربھری مٹی کا ڈھیر بن کر ایک طرف کو لڑھک گیا۔۔۔ اس کے دِل سے درد کی ایک شدید ٹیس اُٹھی۔۔۔ اس کی جو بیوی اس کے قریب کھڑی اس کی اچانک غیر ہوتی ہوئی حالت دیکھ رہی تھی، گھبرا گئی۔۔۔ پوچھنے پر عبدالودود صدیقی صرف یہ بتا سکا کہ ان کے بیٹے کی لاش کون سے ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں پڑی ہے۔۔۔ اس کے بعد عبدالودود صدیقی کی زبان سے کوئی اور کلمہ ادا نہیں ہو سکا۔۔۔

عبدالودود صدیقی کی رہائش گاہ کے باہر سوگواروں کا ایک جم غفیر جمع ہو چکا تھا۔۔۔باپ بیٹے کے جنازے ایک ساتھ اُٹھے تو کہرام برپا ہوگیا۔۔۔کوئی آنکھ ایسی نہیں تھی جو اَشک بار نہ ہو۔۔۔آج کے تازہ اخبار میں ٹارگٹ کلنگ کا شکار ہونے والوں کی جو فہرست چھپی تھی اس میں فیضان صدیقی یا عبدالودود صدیقی کے نام شامل نہیں تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ان دونوں کی اموات گولی لگنے سے وقوع پذیر نہیں ہوئی تھیں۔۔۔ جنازے پر موجود کسی شخص نے ساتھ کے محلے میں ٹارگٹ کلنگ کا شکار ہونے والے ایک نوجوان کی موت کا ذِکر کیا۔۔۔تو دوسرے نے صدیقی باپ بیٹے کی ہارٹ اٹیک سے موت کے تناظر میں تبصرہ کیا۔ ''عزرائیل سب سے بڑا ٹارگٹ کلر ہے۔۔۔'' تیسرے نے بڑبڑاتے ہوئے۔۔۔بات آگے بڑھائی۔۔۔''مگر انسان اُس سے زیادہ سفاک واقع ہوا ہے۔۔۔''

عبدالودود صدیقی کی بیوہ بہت حوصلہ مند خاتون ثابت ہوئی اس نے بیک وقت رُونما ہونے والے ان جان لیوا سانحات میں اپنے اوسان بحال رکھے۔۔۔ان کے اعزّا میّتیں تدفین کے لیے اُٹھانا چاہیے تھے کہ عبدالودود صدیقی کی بیوہ نے انھیں صرف نمازِ جنازہ کی اجازت دی۔۔۔تدفین سے منع کر دیا۔۔۔اس نے برملا کہا کہ میّتوں کی تدفین لاہور میں ہی ہوگی۔۔۔ کیونکہ دونوں باپ بیٹا لاہور ہجرت کر جانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔۔۔ یہاں کی خاک اب مرحومین کی رُوح کو آسودہ نہیں کر سکے گی۔ خاتونِ خانہ جو اَب سربراہِ خانہ بھی تھی کی ہدایت کے مطابق نمازِ جنازہ کے بعد دونوں میّتیں بذریعہ ہوائی جہاز جلد سے جلد لاہور پہنچائے جانے کے انتظامات کر دیئے گئے۔

لاہور میں حفیظ صدیقی جو اپنے بھائی کے اہلِ خانہ کے ساتھ مستقل طور پر لاہور منتقلی کے خیال سے بہت آسودہ خاطر ہوا تھا۔ اب اپنے بھائی اور بھتیجے کی میّتوں کی وصولی اور ان کی تدفین کے انتظامات میں مشغول تھا۔۔۔

عبدالودود صدیقی اور اس کے بیٹے کی میّتیں جب ایئرپورٹ بھجوائے جانے کے لیے بذریعہ ایمبولینس روانہ کی جا رہی تھیں۔۔۔ مرحومین کو الوداع کہنے کے لیے سینکڑوں لوگ وہاں موجود تھے۔۔۔ وہاں موجود سینکڑوں لوگوں کی اکثریت ایسی تھی جنھوں نے ہجرت کا عذاب خود بھی جھیلا تھا اور دوسروں کو بھی اس عذاب سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا۔۔۔مگر ان تمام لوگوں میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جس نے اس سے قبل میّتوں کو ہجرت اختیار کرتے ہوئے دیکھا ہو۔

☆:☆:☆

جواز

—اسد محمود خان—

نیم دائروی چکر۔۔۔

آفتابِ مشرق نے پُورب سے پچھّم تک کا نیم دائروی چکر پورا کیا، کچھ پَل مغرب کے اُفق پر قائم رہا، تب ایک غوطہ کھایا اور مغرب کی آغوش میں ڈُبک گیا۔۔۔ دھیرے دھیرے اس کی آغوش سے سرخی مائل رنگ پُھوٹے جو رفتہ رفتہ شام کے گہرے رنگوں میں تبدیل ہونے لگے۔

پہاڑ کے کندھوں پر سوار۔۔۔

چیڑھ کے لمبے چوڑے درخت جو گھنیرے جنگل کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ جنگل کے بیچوں بیچ دھویں کے سفید بادل۔۔۔ مست خراماں فلک کی جانب لپک رہے تھے جو کھلی فضا میں جاتے ہی آسمانی رنگوں میں تحلیل ہوجاتے۔ دھویں کی اِس باریک لکیر کو پکڑے۔۔۔ چیڑھ کے درختوں سے نیچے اُتریں تو بالآخر چمنی کے راستے فوجی پوسٹ کے لنگر پر جا پہنچیں۔

کشمیر کی خوب صورت وادی میں بنائی گئی۔۔۔

یہ ایک دفاعی پوسٹ تھی جہاں شام سائے ڈھلنے سے پہلے ہی لنگر آباد ہوجاتا۔ شام کے سائے گہرے ہونے تک پوسٹ پر موجود جوان کھانے سے فارغ ہوکر رات کی ڈیوٹی کے لیے اپنی اپنی جگہ پر قائم باش ہوجاتے۔ ڈیوٹیاں بٹ جانے کے بعد لنگر پر وہ چار افراد ہی رہ جاتے۔

ایک لانگری جو بروقت کھانا تیار کرتا اور پوسٹ پر موجود جوانوں کو کھلا کر برمقام ڈیوٹی کے لیے تیار کرتا۔ دوسرا لنگر کا اسٹور مین جو رات کے کھانے کے بعد رات کی چائے اور پھر رات کی چائے کے بعد صبح کے ناشتے کی تیاری میں جُت جاتا۔ تیسرا پوسٹ کمانڈر جو رات بھر چوکس چوکیوں پر چکر لگاتا تھا تاکہ گاہے بہ گاہے سپاہیوں کے الرٹ ہونے کی بابت معلوم ہوتا رہے۔

چوتھی ''وہ'' تھی۔۔۔جو چند ماہ پہلے ہی اِس پوسٹ کا حصہ بنی تھی۔

چند ماہ بیتے۔۔۔

گزرے برسات کی ایک بھیگی شام۔۔۔''وہ'' ٹھنڈ سے ٹھٹھرتی، خاموش قدموں کے ساتھ لنگر تک آئی تھی۔ ابھی کچی عمر میں تھی۔ یہاں تک کیسے پہنچی۔شاید کہیں سے راستہ بھٹک کر اِس طرف کو آن نکلی ہو گی۔۔۔ایک اُس کی کچی عمر دُوجا تندو تیز سرد موسم۔۔۔یہی ہوا ہوگا کہ تندور سے اُٹھتے ''آوانڈوں'' نے اُسے اپنی اُوڑھ کھینچا ہوگا۔تبھی وہ دبے پاؤں بِن دروازے کے لنگر میں داخل ہوئی اور ایک طرف دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

یہ موسم کا اثر تھا۔۔۔

وہ سردی سے کانپتی ،لنگر کی دیوار کے سینے سے جا لگی اور اُس کی آغوش میں سر دبا کر لیٹ گئی۔لنگر پر تندور میں چیڑھ کے بڑے بڑے ''ڈٹے'' ڈال کر ایک بڑے سے تھال کے ساتھ ڈھک دیا جاتا جو رات بھر سیکتے اور سلگتے رہنے کی وجہ سے صبح با آسانی بھڑک جاتے۔یہی وجہ تھی کہ لنگر رات بھر گرم ہی رہتا۔

اگلی صبح۔۔۔

پوسٹ کمانڈر جو ایک حوالدار تھا سب سے پہلے لنگر پر پہنچا۔حوالدار ''اُسے'' دیوار کی آغوش میں اتنی بے تکلفی سے لیٹا دیکھ چونک گیا۔

''یہ۔۔۔یہ۔۔۔یہ کہاں سے آئی ہے۔'' وہ حیرت بھرے لہجے میں دھاڑا۔

''وہ''۔۔۔

حوالدار کی دھاڑ سن کر ڈری سہمی اُٹھ بیٹھی اور فریاد بھری نظروں سے حوالدار کی جانب دیکھنے گی جو اُس کے قریب آ کر رُک چکا تھا۔

حوالدار کا اِس صنفِ جاذب نظر سے جانے کب کا بیر تھا۔غصے سے بے قابو دھاڑتے ہوئے اُس کی جانب لپکا۔۔۔ایک ہاتھ سے اُس کی پتلی کمزور گردن پکڑی اور پوری قوت سے گھسیٹتا،لنگر سے باہر دے مارا۔دوسری جانب اُس کے منہ سے ایک طوفانِ بدتمیزی اُمڈ رہا تھا۔

''یہ یہاں تک آئی کیسے۔۔۔یقیناً تم لوگوں میں سے کسی کی محبت جاگی ہو گی۔۔۔اور اور۔۔۔اِسے تو دیکھو۔۔۔جانے کہاں سے آن ٹپکی۔۔۔تجھے پیچھے کہیں بھی جگہ نہ ملی تھی۔۔۔'' حوالدار بس بولتا گیا۔

وہ صورتِ حال سے سخت گھبرائی۔۔۔اُس کی خوب آنکھوں اُترے خوف کے بادل گرج

گرج برسنے لگے۔۔۔ دل خراش چیخیں وادی اندر لوٹنے لگیں۔۔۔ بے چاری کی جان ہی کتنی تھی۔ فوجی ہاتھ کے ایک ہی جھٹکے سے ہَوا میں اُچھلی اور قریب کے برساتی نالے میں جا پڑی۔ اُس کی چیخوں نے جنگل کو ہلا کر رکھ دیا۔ لانگری اور اسٹور مین جو حوالدار کے پیچھے ہی لنگر کی جانب آ رہے تھے۔۔۔ یہ منظر دیکھ کر لرز گئے۔

وہ چیخی، چلائی، کسمسائی اور دھیرے دھیرے اُس کی چیخیں دم توڑنے لگیں۔ بالآخر وہ تروڑ مروڑ کر سمیٹتی سمٹی اور گردن ایک جانب ڈھلکائے۔۔۔ سسکیاں لیتے لیتے بے سدھ ہوگئی۔

حوالدار اِس منظر سے لاتعلق اُسے ''تولتا'' رہا پھر لانگری سے مخاطب ہوا۔

''کیا مڑ مڑ اُسے گھورتا ہے۔۔۔ جلدی کر۔۔۔ ناشتہ بنا۔۔۔ یہ خود ہی واپس لوٹ جائے گی۔'' اُس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''سپاہی ڈیوٹیوں سے آتے ہوں گے۔۔۔ دیر ہوئی تو کہیں اِسی کے پاس نہ جا گرے۔۔۔ سمجھا!'' حوالدار نے بات پوری کرتے ہوئے کہا۔

لانگری کوئی جواب نہ دے پایا۔ بس آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس نے سٹور مین کو کچھ بات کہی اور ناشتہ بنانے کی تیاری کرنے لگا۔

''اور ہاں! یہ تیری لاپرواہی ہے کہ رات وہ آوارہ لنگر میں آن گھسی۔'' حوالدار نے لانگری سے کہا۔

''پر شکر ہے جو کہیں کسی کے بستر پر چڑھ جاتی تو۔۔۔!'' حوالدار نے مزید کہا۔

''توبہ۔۔۔ توبہ۔۔۔'' پھر خود ہی جواب دیا۔

اِس دوران لانگری سر پھینکے ناشتہ بنانے میں مگن رہا جب کہ حوالدار اُسے گھورتا۔۔۔ پاؤں پٹختا۔۔۔ واپس پوسٹ کی جانب بڑھ گیا۔

حوالدار کے جاتے ہی سٹور مین تیزی سے نیچے اُترا، اُس کے پاس جا کر اُسے ہلایا تو وہ ابھی تک زندہ تھی۔ اُسے اُٹھایا اور احتیاط سے قریب دھری بوری پر لیٹا دیا۔ اِس دوران ناشتہ تیار ہُوا اور سب میں تقسیم ہوگیا۔ لانگری ناشتہ لے کر حوالدار کے پاس گیا تو وہ کچھ کہنا چاہتا تھا پر بات نہ کر پایا اور واپس لوٹ گیا۔

''اوئے سن۔۔۔ ناشتہ کرا۔۔۔ اور چلتا کر اُس آوارہ کو۔۔۔'' حوالدار نے خود سے بات شروع کی۔

''پر استاد جی! مجھے لگتا ہے اِس کا کوئی نہیں ہے۔۔۔'' لانگری جلدی سے بولا۔

حوالدار بھی شاید سمجھ گیا فوراً بولا۔۔۔''اچھا! اچھا!۔۔۔یہ زیادہ رشتہ داریاں پالنے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔اور دیکھو۔۔۔ مجھے جو یہ لنگر کے اندر دکھائی دی تو پھر تو بھی اُس کے ساتھ ہی جائے گا۔'' حوالدار نے مکمل آرڈر دے ڈالے۔ لانگری جواب دیے بغیر پلٹا اور دوڑ کر اُس کے پاس جا پہنچا۔

وہ قدرے سنبھل چکی تھی۔

یوں تو پوسٹ پر اُس کا وجود ایک سوال کے جیسا ہی تھا۔۔۔لیکن وہاں موجود سبھوں کی رضا مندی نے اُس کے رہنے کا جواز بنا ہی لیا۔ اُس میں کچھ صلاحیتیں غیر معمولی تھیں۔ وہ دور کی آوازوں کو عام کان سے پہلے سُن لیتی۔ عام آنکھ سے زیادہ روشن نگاہ رکھتی۔ اُس کی محبت کے جذبات بھی کچھ غیر معمولی تھے۔ وہ کسی ایک سے نہیں۔۔۔اُن سب سے محبت کا جذبہ رکھتی تھی۔ اُن کے ہاتھوں میں جھومنا اُسے اچھا لگتا تھا۔ اُن کے پیار کی بولی کو وہ سمجھتی اور اُن کے پیروں میں محبت کی زنجیریں ڈال کر جھگڑنے کی کوشش کرتی اور پھر سبھی اُس کے جال میں پھنستے چلے گئے۔

رفتہ رفتہ وہ لنگر کی روٹیاں کھا کر پروان چڑھنے لگی۔

وہ پوسٹ اور پوسٹ کے جوانوں سے مانوس ہو چکی تھی۔۔۔خصوصاً لانگری اور سٹور مین سے تو اُس کی خوب بنتی تھی۔۔۔وہ جب بھی کچھ کہنا چاہتی تو اُنہی کے پاس آ کر خاموشی سے کہہ جاتی۔ وہ اُس کی بات سمجھ کر۔۔۔اُس کی من مراد کو پورا کرتے۔۔۔یوں ایک رشتہ تھا جو خون کے رشتوں سے زیادہ گہرے رنگوں کے ساتھ پروان چڑھنے لگا۔

وہ بہت خوش تھی۔

پوسٹ کے سارے جوان اُس سے محبت کرنے لگے تھے۔ وہ اُن سے باتیں کرتی اور وہ اُس سے باتیں کرتے۔ اب تو وہ اکثر جوانوں کے ساتھ قریب کے چشمے پر بھی جایا کرتی تھی۔۔۔اور تو اور۔۔۔کئی ایک بار تو ڈیوٹی والے سپاہیوں سنگ چوکس چوکی میں راتیں بھی گزارتی۔ یہی نہیں وہ تو اُن کے بہت سے کام بھی کرنے لگی تھی۔

راشن میں آئی مرغیوں کا خیال رکھتی۔ سنتری سنگ ڈیوٹی دیتی۔ کبھی کبھار پوسٹ سے آگے نکل جاتی کہ کہیں کچھ ڈھکے چھپے تو نہیں ہو رہا۔ وہ دشمن کی گن لوڈنگ اور فائرنگ پر چیخنے لگتی اور سپاہی اوٹ میں ہونے لگتے۔ وہ کرال کرال میں بھاگتی پھرتی۔

اب وہ ایک مکمل سپاہی تھی۔۔۔ایک خاموش سپاہی۔۔۔اور پوسٹ کا حصہ۔۔۔

سب جوانوں کی زبان پر اُس کی تعریفیں تھیں لیکن پوسٹ کمانڈر اب بھی جذبات سے عاری فقط دور ہی دور سے اُسے دیکھتا۔

''اوے۔۔۔ یہ کیا تم اِسے ہر وقت ساتھ لیے لیے پھرتے ہو۔۔۔'' آج بھی حوالدار نے اُسے ایک سپاہی کے ساتھ چشمے کی طرف جاتا دیکھ کر سوال کیا۔

''استاد جی!۔۔۔ یہ تو اب ہر مشکل کی ساتھی ہے۔۔۔'' سپاہی نے ادھورا جواب دیا۔

''ہوں ں ں!۔۔۔ یہ نکمّی۔۔۔ چھ فُٹے حوالداروں کی بغل میں گھومے گی۔۔۔'' حوالدار نے جل بھن کر کہا۔

''اوہ! استاد جی!۔۔۔ اُس دن بھی اگر یہ بروقت آگاہ نہ کرتی تو دشمن کی جانب سے آیا فائر سیدھا چشمے پر گرتا۔۔۔ اور یقیناً بڑا نقصان کر جاتا۔۔۔'' سپاہی نے اُس کی طرف داری کرتے ہوئے کہا۔

''او!۔۔۔ بس!۔۔۔ باتیں کم کر اور اُس سے زیادہ اپنی تربیت پر توجہ دے۔۔۔ وہ تیرے زیادہ کام آئے گی۔۔۔'' حوالدار نے قائل نہ ہوتے ہوئے کہا۔

''جی استاد جی!۔۔۔'' سپاہی نے لاجواب ہو کر ہتھیار ڈالے اور چشمے کی جانب بڑھ گیا۔

پچھلی رات بارش خوب کھل کر برسی تھی اور اِسی دوران کرال ٹرنچ (Crawl Trench) کی دیوار گر گئی تھی۔ پوسٹ کمانڈر نے فیصلہ کیا کہ راتوں رات اِسے بنا دیا جائے ورنہ صبح دشمن کی توپوں کے دھانے اُنھیں اِس جگہ سے گزرنے نہیں دیں گی اور نہ ہی کچھ کام ہی کرنے دیں گی۔۔۔ پھر یہ جگہ بھی ''مارک'' ہو جائے گی اور ایک مستقل پریشانی کا باعث رہے گی۔

حوالدار نے پوسٹ پر ڈیوٹی سے بچ جانے والی نفری ساتھ میں لی اور کرال ٹرنچ کی مرمت کا کام کرنے چل پڑا۔

وہ بھی اُن کے ہمراہ کرال کے پاس ہی بیٹھ گئی۔۔۔ اُس کی نظریں بارڈر پار دشمن کی پوسٹوں کی جانب لگی ہوئیں تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ اُس کا ساتھ حوالدار کو کبھی بھی گوارا نہیں ہوتا لیکن وہ اپنی فطرتی محبت سے بے تاب ہو کر اُن کے ساتھ گئی اور لک چھپ کر اُنھیں کام کرتا دیکھتی رہی۔ راتوں رات کرال کا کام ختم ہوا اور حوالدار خوشی کے نعرے لگاتا۔۔۔ سب کو ''شاباش!۔۔۔ شاباش!''۔۔۔ کہتا واپس پوسٹ پر آ گیا۔

اگلی صبح جب حوالدار اُٹھا تو سب سے پہلے کرال ٹرنچ کی جانب گیا تا کہ رات کی گئی محنت کو دیکھ کر اندازہ کرے کہ کیا رنگ لائی ہے۔ ابھی وہ کرال کے پاس پہنچا ہی تھا کہ گری دیوار دیکھ کر اُس کے منہ سے نکلا۔

''اوئے تیری!۔۔۔'' اُس کی نظر گری دیوار کے اس حصے پر پڑی، جہاں وہ دھنسی بیٹھی تھی۔

وہ بارش میں مکمل بھیگ چکی تھی۔۔۔اور شاید رات بھر بھیگتی رہی ہوگی۔۔۔جو اِس شدت سے ٹھٹھر رہی تھی۔

''میری رات بھر کی محنت تو نے غارت کر دی۔۔۔آج تو مجھ سے نہیں بچ پائے گی۔۔۔''

حوالدار نے اُسے موردِ الزام ٹھہرا کر رائفل سیدھی کی اور بے دریغ گولی کا دھکتا سیسہ اُس کے سردی سے ٹھٹھرتے بدن میں اُتار دیا۔

وہ بے چاری۔۔۔

رات بھر سے یونہی بیٹھی تھی۔۔۔اب بیٹھے بیٹھے لیٹ گئی۔۔۔

فائر کی آواز سن کر سنتری باہر نکلا تو دیکھا وہ کرال کے گرے ہوئے حصے کے سامنے ساکت پڑی ہے اور استاد کے منہ سے گالیاں جاری ہیں۔سنتری پل بھر میں سارا ماجرا جان گیا۔

''استاد۔۔۔وہاں سے ہٹو۔۔۔دشمن کا فائر آ جائے گا۔۔۔'' سنتری چیخا لیکن استاد تو جیسے پچھلے سارے غصے کو آج ہی نکال کر دم لینے والا تھا۔اِس دوران سنتری نے فضا میں مارٹر کے گولے کی ''پھرکی'' کی سیٹی جیسی آواز سنی۔

''فائر۔۔۔فائر۔۔۔فائر۔۔۔'' سنتری چیخا۔

یہ اعلانیہ تھا۔۔۔

جو مارٹر فائر کے دوران پکارا جاتا کہ پوسٹ والے اپنے حفاظتی مورچوں میں پہنچ جائیں اور محفوظ رہتے ہوئے اگلے علاقے پر نظر رکھیں۔استاد نے چونک کر سنتری پوسٹ کی جانب دیکھا۔۔۔پھر پلٹا۔۔۔لیکن کچھ دیر گزری۔۔۔ایک گولہ کرال ٹرنچ میں ٹھیک اُسی مقام سے چند گز کے فاصلے پر گر کر پھٹا جہاں حوالدار کھڑا تھا۔گولے کا ایک ٹکڑا حوالدار کی ٹانگ پر لگا۔

وہ خون میں لتھڑا کر گر پڑا۔

حوالدار کرالنگ کرتا ہوا پوسٹ پر پہنچا۔اُس کی نظریں واپس کرال کے ٹوٹے حصے کی جانب اُٹھیں جہاں وہ نیم وا آنکھوں میں محبت کے ساتھ مردہ پڑی تھی۔

''اوہ!۔۔۔تو وہ۔۔۔'' حوالدار کے منہ سے اتنا ہی نکل پایا۔

☆:☆:☆

غزلیں

— آفتاب احمد —

دھنک مزاج تھی ، زخموں کو پھول کر رہی تھی
وہ سبز آگ جو مجھ میں حلول کر رہی تھی

اِک عمر تک مرا اِنکار کر کے یہ دُنیا!
بڑے ہی چاؤ سے مجھ کو قبول کر رہی تھی

میں ہنس رہا تھا ستارے سجا کے پلکوں پر
عجب خوشی تھی جو دِل کو ملول کر رہی تھی

میں لکھتا جاتا تھا اُس کو غزل کے مصحف میں
بشکلِ شعر جو آیت نزول کر رہی تھی

میں سیدھی راہ پہ آیا ہوں لغزشوں کے سبب
ستم یہ مجھ پہ مری کوئی بھول کر رہی تھی

نہ جانے کونسے رستے کی گرد تھی احمدؔ
جو عمر بھر کی مسافت کو دھول کر رہی تھی

آگ میں میری کوئی رنگ جلانے کا نہیں
اس لیے میرا الاؤ نظر آنے کا نہیں

خواب سے اپنا تعلق ہے تو بس اتنا ہی
اور سب کچھ ہے مگر خواب دکھانے کا نہیں

مجھ سے روشن ہے یہ آئینۂ عَالم تیرا
اور پھر میں ہی ترے آئینہ خانے کا نہیں

یونہی بھٹکے گی کہاں تک یہ نظر کی حیرت
کوئی منظر بھی اسے راہ پہ لانے کا نہیں

اپنے پتوار پہ کرنا ہے بھروسہ ہم کو
کام دریا کا ہمیں پار لگانے کا نہیں

ریگِ صحرا پہ کوئی نقش سلامت کب ہے
مسئلہ صرف مرے پاؤں جمانے کا نہیں

ورنہ ڈھل جاتا اِسی رنگ میں کب کا میں بھی
مجھ کو لگتا ہے کہ میں اپنے زمانے کا نہیں

میں بھی اس دشت کا حصہ ہوں مگر کام مِرا
آفتابؔ اس میں فقط خاک اُڑانے کا نہیں

جلو میں لے کے جو عزم سفر نکل پڑے تھے
ہماری راہ میں کتنے چراغ جل پڑے تھے
میں اپنی ناؤ سرِ سطحِ آب کیا لایا
خفا تھی موج کہیں پانیوں میں بل پڑے تھے
بہ شکلِ اشک گرا تھا میں اس زمیں پہ کبھی
مرے وجود سے دریا کئی اُبل پڑے تھے
تلاشِ مرگ میں نکلے ہوئے نہ دیکھ سکے
اُسی نواح میں جینے کے چار پل پڑے تھے
ازل سے کس لیے گردش میں ہیں زمان و مکاں
ہمارے آنے سے دونوں میں کیا خلل پڑے تھے
خدا کا شکر کہ اشکِ تپاں نکل آیا
ہماری آنکھ میں مُدّت سے خواب شل پڑے تھے
بنی ہوئی تھی مری ذات مسئلہ احمؔد
میں درمیاں سے ہٹا تو ہزار حل پڑے تھے

بارش سے نہ دریا کی روانی سے بنی ہے
یہ جھیل مری آنکھ کے پانی سے بنی ہے
الفاظ دِکھاتے رہے اِک اور ہی منظر
اِک اور ہی تصویر معانی سے بنی ہے
عجلت میں بھی تاخیر ہوئی جاتی ہے مجھ کو
گویا یہ رکاوٹ بھی روانی سے بنی ہے
اِک اور فسانہ بھی فسانے میں ہے شامِل
اِک اور کہانی بھی کہانی سے بنی ہے
اس رونقِ بازار کی ہے وجہ کوئی اور
یہ بھیڑ تو اشیاء کی گرانی سے بنی ہے
خوشبو مرے آنگن میں یونہی تو نہیں اُتری
کچھ دِن سے مری رات کی رانی سے بنی ہے
ہجرت پہ جہاں کوئی بھی تیار نہیں تھا
ہر بات وہاں نقل مکانی سے بنی ہے
جس رہ پہ کوئی نقشِ قدم ثبت نہ ہو گا
وہ میرے گزرنے کی نشانی سے بنی ہے
ماضی سے بھی نسبت کوئی لازم ہے کہ احمؔد
ہر صبح نئی شام پُرانی سے بنی ہے

اہلِ خبر کو کیوں یہ خبر ہو نہیں رہی
بجھنے لگے چراغ سحر ہو نہیں رہی
اِک جست پر کھڑی ہے مِری منزلِ مراد
اور مجھ سے طے یہ راہگزر ہو نہیں رہی
کیسے بسر کروں گا ترے ساتھ زندگی
میری تو اپنے ساتھ بسر ہو نہیں رہی
یوں تو ہمارے عہد میں کیا ہو نہیں رہا
لیکن تمیزِ عیب و ہنر ہو نہیں رہی
کب تک سنبھال پائے گی اپنے وجود کو
دیوار ، جو دریچہ و دَر ہو نہیں رہی
منظر اِک اور ہے پسِ منظر میں آفتابؔ
تجھ بن جدھر کسی کی نظر ہو نہیں رہی

غزلیں

—احمد خیال—

بستی سے چند روز کنارہ کروں گا میں
وحشت کو جا کے دشت میں مارا کروں گا میں

ویسے تو یہ زمین مرے خواب سی نہیں
لیکن اب اس کے ساتھ گزارا کروں گا میں

شاید کہ اس سے مردہ سمندر میں جان آئے
صحرا میں کشتیوں کو اُتارا کروں گا میں

منظر کا رنگ رنگ نگاہوں میں آئے گا
اک ایسے زاویے سے نظارہ کروں گا میں

اے مہرباں اجل مجھے کچھ وقت چاہیے
جب جی بھرا تو تم کو اشارہ کروں گا میں

اور کب تک یوں تمہارے ناز اٹھانے چاہئیں
کچھ بتا اے زندگی ، کتنے زمانے چاہئیں

میں نے کافی دیر تک آنکھوں سے چھوئی ہے دھنک
اب تو مجھ کو سات رنگے خواب آنے چاہئیں

راستے میں دشت ہے، کوزہ گروں کو رات بھر
جتنے ممکن ہو سکیں ، کوزے بنانے چاہئیں

باغ میں وہ آ گیا تو زرد رت کے باوجود
خار ہوتی ٹہنیوں پر پھول آنے چاہئیں

ایک دن رستہ بھٹک کر کشتیوں کے قافلے
اس زمیں سے دُور اُفق کے پار جانے چاہئیں

جس کے دم سے زندگی تھی ،اس کی رخصت کے سمے
ہونٹ تھوڑی دیر تک تو کپکپانے چاہئیں

غزل

—احمد طلال آصف—

یہ شہرِ خواب نظر میں بسا گیا ہے کوئی
دِل و دماغ پہ یکبار چھا گیا ہے کوئی

قدم رُکیں گے نہ اب راہِ زیست میں اپنے
میرے وجود میں ہلچل مچا گیا ہے کوئی

بھلا نہ پاؤں بھلانا بھی میں اگر چاہوں
کچھ اس طرح کی ادائیں دِکھا گیا ہے کوئی

یہ کون آیا تھا محفل میں رات چپکے سے
کہ جاتے جاتے سبھی کو رُلا گیا ہے کوئی

نہیں ہے آنکھ جھپکنے کا بھی مجھے یارا
نظر کے راستے یوں دِل میں آ گیا ہے کوئی

غزل

—احمد نشاط—

اب نہیں یاد ، کسی سمت سے در آیا تھا
قافلہ تیز ہواؤں کا ادھر آیا تھا

شاخِ اُمید پہ کچھ پل ہی ثمر آیا تھا
وہ کہاں آیا ، دُعاؤں میں اثر آیا تھا

پہلے کُہسار کے سینے سے ہوا شِیر رواں
پھر کہیں جا کے محبت کا ہنر آیا تھا

رات وہ شوقِ غزل تھا کہ نئے جذب کے ساتھ
سرِ قرطاس مرا دِل بھی اُتر آیا تھا

لوگ ڈرتے تھے مرے خوف زدہ ظاہر سے
درد اندر کا جو چہرے سے اُبھر آیا تھا

———

غزلیں

—اختر رضا سلیمی—

تمہارے ہونے کا شاید سراغ پانے لگے
کنارِ چشم کئی خواب سر اُٹھانے لگے

پلک جھپکنے میں گزرے کسی فلک سے ہم
کسی گلی سے گزرتے ہوئے زمانے لگے

مرا خیال تھا یہ سلسلہ دئیوں تک ہے
مگر یہ لوگ مرے خواب بھی بجھانے لگے

نجانے رات ترے مے کشوں کو کیا سوجھی
سبو اُٹھاتے اُٹھاتے فلک اُٹھانے لگے

وہ گھر کرے کسی دِل میں تو عین ممکن ہے
ہماری دربدری بھی کسی ٹھکانے لگے

میں گنگناتے ہوئے جا رہا تھا نام ترا
شجر حجر بھی مرے ساتھ گنگنانے لگے

حدودِ دشت میں آبادیاں جو ہونے لگیں
ہم اپنے شہر میں تنہائیاں بسانے لگے

دھواں دھنک ہوا انگار پھول بنتے گئے
تمہارے ہاتھ بھی کیا معجزے دکھانے لگے

ادھر سے گزرے جو اختر کبھی بہار کے ساتھ
تو پھول ہم کو تری داستاں سنانے لگے

رضّا وہ رن پڑا کل شب بہ رزم گاہِ جنوں
کلاہیں چھوڑ کے سب لوگ سر بچانے لگے

نسیم صبح کا جب کارواں گزرتا ہے
ترے گزرنے کا مجھ کو گماں گزرتا ہے

ترا وصال محیط ایک پل پہ تھا لیکن
ترے وصال کا پل بھی کہاں گزرتا ہے

عزیز تر ہے مجھے لامکاں کی صدیوں سے
وہ ایک پل جو تہ آسماں گزرتا ہے

کبھی گوارا تھی دِل کو تری رفاقت بھی
اب اپنا ہونا بھی اس پر گراں گزرتا ہے

چمن سے اب کے رضّا یوں گزر رہی ہے بہار
کہ جیسے جاں سے کوئی نیم جاں گزرتا ہے

غزلیں

—ارشاد جالندھری—

ذرا بھی غم نہیں غم کا ہوئے مانوس یوں غم سے
یہ حالت ہوگئی اب تو کہ غم بیزار ہیں ہم سے

ہزاروں اُلجھنیں سوچوں پہ قابض ہوگئیں یکدم
ہوئے مرعوب ہم ایسے فقط اِک زُلف کے خم سے

نظر انداز جو کرتا رہا میری وفاؤں کو
یہ حیرت ہے وہی اچھا لگا کیوں سارے عالم سے

مرے جانے کے بعد اُن کو بھی یہ احساس ہو شاید
نہیں محفل میں وہ رونق جو رونق تھی مرے دم سے

ہمیشہ ہی رہے ارشادؔ اُن کے رازداں بن کر
خدا جانے وہ کیوں پھر بھی نظر آتے ہیں برہم سے

مجھ پہ اُس نامہرباں کی اِک نظر ہو تو سہی
اے خدا میری دُعا میں کچھ اثر ہو تو سہی

ہر قدم پر ہی ملیں گے میرے سجدوں کے نشاں
اس طرف بھی کوئی اُس کی رہگزر ہو تو سہی

پھر جہاں میں کون ہوگا مجھ سے بڑھ کر خوش نصیب
عمر اُس کی قربتوں میں کچھ بسر ہو تو سہی

جان بھی قربان کر دیں گے وفا کی راہ میں
چند لمحوں کے لیے وہ ہمسفر ہو تو سہی

یہ تیرا احسان ہو گا حشر تک ارشادؔ پر
اے شبِ ہجراں ذرا تو مختصر ہو تو سہی

غزل

—اسلم سحاب ہاشمی—

ہوا کی لوح پر سب کا فسانہ لکھ دیا ہے
تری میری کہانی کو زمانہ لکھ دیا ہے

زمانہ دَر زمانہ داستاں جاری ہے کوئی
کہیں ماتم کہیں پر شادیانہ لکھ دیا ہے

زبان آز آخر چاٹ ڈالے گی تجھے بھی
کہ ہر دیوار کی قسمت گرانا لکھ دیا ہے

گل و لالہ نظر کے حسن کا ساماں ہیں دونوں
مگر لالے کا صحرا میں ٹھکانہ لکھ دیا ہے

سخن ور کام لیتے ہیں اذاں کا شاعری سے
ہمارا کام لوگوں کو جگانا لکھ دیا ہے

مجھے کاشانۂ غربت ہے تاج بادشاہی
غریبی میں مزاج اپنا شہانہ لکھ دیا ہے

مری آہ و فغاں سن کر کہا نخوت نشیں نے
خدا نے ہی تمھیں میرا دوانہ لکھ دیا ہے

تغافل ، ہجر ، رُسوائی سحابؔ اپنا مقدر ہے
روا عشاق پر ہوں ظلم ڈھانا لکھ دیا ہے

غزلیں

—اطہر ناسک—

وفا کی جنگ مت کرنا کہ یہ بیکار جاتی ہے　　زمانہ جیت جاتا ہے ، محبت ہار جاتی ہے
چلی آتی ہے جانے کس گلی سے یہ شبِ ہجراں　　نجانے کس کے گھر یہ ماتمی تلوار جاتی ہے
نجانے کونسی منزل ہے آخر زندگی تیری　　نجانے کس طرف کو یہ رہِ دُشوار جاتی ہے
میں آ کر بیٹھ سکتا ہوں تمھاری بزم میں لیکن　　تمھارے پاؤں چھونے سے مری دستار جاتی ہے
کچھ ایسے زلزلوں کی زد میں آیا ہے مکان ناسکؔ
میں چھت کو تھامنے لگتا ہوں تو دیوار جاتی ہے

میں تجھے بھولنا چاہوں بھی تو ناممکن ہے　　تو میری پہلی محبت ہے مرا محسن ہے
میں اسے صبح نہ جانوں جو ترے سنگ نہیں　　میں اسے شام نہ مانو کہ جو تیرے بن ہے
کیسا منظر ہے ترے ہجر کے پس منظر کا　　ریگِ صحرا ہے رواں اور ہوا ساکن ہے
تیری آنکھوں سے تری باتوں سے لگتا تو نہیں　　مرے احباب یہ کہتے ہیں کہ تو کم سن ہے
ابھی کچھ دیر میں ہو جائے گا آنگن جل تھل　　ابھی آغاز ہے بارش کا ابھی کن من ہے
عین ممکن ہے کہ کل وقت فقط میرا ہو　　آج مٹھی میں یہ آیا ہوا پہلا دِن ہے
آج کا دِن تو بہت خیر سے گزار ناسکؔ
کل کی کیوں فکر کروں کل کا خدا ضامن ہے

غزلیں

—افضل خان—

فقط اِک عمر کی مہلت ہے مرہونِ جنوں وہ بھی　　برا ہو ایسی حسرت کا کروں یہ بھی کروں وہ بھی
نہیں اے ثالثینِ عشق میں ایسے نہ مانوں گا　　یہ بات اس وقت ہونی چاہیے جب میں بھی ہوں وہ بھی
لکیروں کی جگہ کھینچا گیا ہے رنج ہاتھوں پر　　عجب سی صورتِ حالات ہے اور جوں کی توں وہ بھی
مقدس اور بھی مجھ کو مقدس لمس ہے تیرا　　نمک گر جائے زخموں سے تو پلکوں سے چنوں وہ بھی
مرا سارا اثاثہ اِک تعلق تھا اِک آئینہ　　مگر اِک روز جی چاہا کہ یہ بھی توڑ دوں وہ بھی

وصال اپنی جگہ افضؔل فراق اپنی جگہ لیکن
میسر یہ نہیں ہم کو اگر آتا تو کیوں وہ بھی

یہ جو ہم حرفوں سے اصنام گری سوچتے ہیں　　ایک لمحے کے لیے ایک صدی سوچتے ہیں
ایک دم کیوں تجھے جانے کی اجازت دے دیں　　بات ہی سوچنے والی ہے تبھی سوچتے ہیں
آئینے! تجھ سے کئی بار ملے ہیں ہم تو　　تیری حیرانی کو ہم بے خبری سوچتے ہیں
فتویٰ سازانِ مشیت سے کہے کون بھلا　　آپ جو سوچتے ہیں ہم بھی وہی سوچتے ہیں
وصل اور ہجر تذبذب میں کھڑے ہیں دونوں　　ہم کبھی فیصلہ کرتے ہیں کبھی سوچتے ہیں

ہم سے اُمید نہ رکھ عشق پرستی کی کہ ہم
گفتگو کے لیے بھی بات نئی سوچتے ہیں

غزلیں

—افضل گوہر—

میں مکمل ہوں دُعائے خواب سے
اور کیا مانگوں خدائے خواب سے

مجھ میں ہے اِک بھربھری مٹی کا خوف
سو پریشاں ہوں ہوائے خواب سے

یہ کہاں سے مجھ میں دَر آیا ہجوم
جسم بوجھل ہے فضائے خواب سے

آنکھ اندر جھلملاتے ہیں چراغ
کون گزرا آبنائے خواب سے

درمیاں سے رات کس نے کھینچ لی
مر رہا ہوں میں قضائے خواب سے

نیند آئی نہ کُھلا رات کا بستر مجھ سے
گفتگو کرتا رہا چاند برابر مجھ سے

کونسی ایسی کمی میرے خدوخال میں ہے
آئنہ خوش نہیں ہوتا کبھی مِل کر مجھ سے

دشت کی سمت نکل آیا ہے میرا دریا
بس اسی پر ہیں خفا سارے سمندر مجھ سے

کیا مصیبت ہے کہ ہر دِن کی مشقت کے عوض
باندھ جاتا ہے کوئی رات کا پتھر مجھ سے

اپنا سایہ اُسے خیرات میں دے آیا ہوں
دُھوپ کے ڈر سے جو لپٹا رہا دِن بھر مجھ سے

اپنے ہاتھوں کو جو کشکول بنایا گوہؔر
گر پڑا جانے کہاں میرا مقدر مجھ سے

کونسا جرم کیا تم سے بچھڑ کر ایسا
اپنے ہاتھوں میں ہی لکھا تھا مقدر ایسا

زخم کا پھول کھلا ہے تو مہک اُٹھا ہوں
ورنہ پہلے تھا کہاں جسم معطر ایسا

آنکھ سے نیند کی پٹی نہیں کھلتی مجھ سے
خواب میں کونسا دَر آیا ہے منظر ایسا

اب میں پیڑوں کی طرح چھاؤں بھی دے سکتا ہوں
آ گیا سایہ مرے قد کے برابر ایسا

خواب کی موت بھی ہو سکتی ہے افضل گوہؔر
گرد آلود ہوا ہے مرا بستر ایسا

غزل

—اقرار مصطفیٰ—

یہ تو سچ ہے کہ بات پوری نہیں
پر مری داستاں ادھوری نہیں

اُس کی باتوں سے لگ رہا ہے مجھے
اب میں اس کے لیے ضروری نہیں

صورتِ دِل جو مجھ میں تو دھڑکے
تب میں مانوں کہ مجھ سے دُوری نہیں

ایسے جینے پہ خاک ہی ڈالیں
محفلِ حُسن میں حضوری نہیں

پھر بھی وہ ضوفشاں سا رہتا ہے
گرچہ اُس کا لباس نوری نہیں

اے مرے یار! جی انا کے ساتھ
اے مرے یار! جی حضوری نہیں

تیرے انکار پر مرا اقرارؔ
فیصلہ یہ مرا شعوری نہیں!

غزلیں

—امتیاز علی گوہؔر—

عذابِ خواب میں کچھ اس طرح گڑے ہوئے ہیں   ہمارے جسم کہیں نیند میں پڑے ہوئے ہیں
ہمارے وہم و گماں پر جمود کیسا ہے   کہ ایک موڑ پہ ہی اب تلک کھڑے ہوئے ہیں
وگرنہ رُوح بدن سے اُڑان کر جاتی   کہیں پہ سانس کے دھاگے ابھی اَڑے ہوئے ہیں
رُکا ہوا ہے شجر سے مکالمہ میرا   کہ شاخ شاخ سے پتے بہت جھڑے ہوئے ہیں
کسی کی بات کا شکوہ کریں تو کیسے کریں   ہم اپنے آپ سے بھی ان دِنوں لڑے ہوئے ہیں
اِک ایک پل مجھے لگتا ہے سال کا گوہؔر
عجیب ہجر کے موسم میں دِن بڑے ہوئے ہیں

ہم بھی کس غم کی بود و باش میں ہیں   سینکڑوں درد اِک خراش میں ہیں
قاتلوں سے ثبوت کیا مانگوں   قتل کے بھید سارے لاش میں ہیں
مرنے والے تو پا گئے منزل   جینے والے ابھی تلاش میں ہیں
کھیلنے والا جانتا ہو اگر   کتنے ہی کھیل ایک تاش میں ہیں
میں زمانے سے کیا کہوں گوہؔر
فکر کتنے مجھے معاش میں ہیں

غزلیں

—باقی احمد پوری—

شام ہوتی ہے تو ہم گھر سے نکل جاتے ہیں
اور کچھ دیر کو غم گھر سے نکل جاتے ہیں

رات بھر ٹوٹتے رہتے ہیں ستاروں کی طرح
صبح پھر ہو کے بہم گھر سے نکل جاتے ہیں

ذہن تھک جاتا ہے اِک یاد کو لکھتے لکھتے
چھوڑ کے لوح و قلم گھر سے نکل جاتے ہیں

اب کوئی دشتِ محبت میں بلاتا بھی نہیں
خود بخود میرے قدم گھر سے نکل جاتے ہیں

تشنگی ریت کی دیکھی نہیں جاتی ہم سے
ہو کے با دیدۂ نم گھر سے نکل جاتے ہیں

روز کھاتے ہیں قسم گھر میں رہیں گے باقیؔ
توڑ کے روز قسم گھر سے نکل جاتے ہیں

پہلے تو لپکتی ہوئی تلوار سنبھالے
دستار کو پھر صاحبِ دستار سنبھالے

سورج کے نکلتے ہی نکل پڑتا ہے سایہ
دیوار کہاں سایۂ دیوار سنبھالے

میں کوچۂ دلدار میں خود کھاتا ہوں ٹھوکر
گرتا ہوں کہ بانہوں میں مجھے یار سنبھالے

دو پل کا سہارا تو سہارا نہیں ہوتا
وہ مجھ کو سنبھالے تو لگاتار سنبھالے

یہ عشق کا آزار قیامت ہے قیامت
کب تک دلِ بے چارہ یہ آزار سنبھالے

اس شہر نے ہر روز مجھے قتل کیا ہے
کیا خود کو یہاں میرا عزادار سنبھالے

بازار سے جس وقت گزرتا ہے وہ باقیؔ
بازار نہ پھر گرمئ بازار سنبھالے

میلہ غموں کا گردشِ حالات مت لگا   اِس کربلا میں خیمۂ سادات مت لگا
آتا ہے خود شکار نگاہوں کے سامنے   یہ صیدگاہِ دِل ہے یہاں گھات مت لگا
میں نے تو ایک بات کہی تھی مذاق میں   اتنی بھی اپنے دِل پہ مری بات مت لگا
مانا کہ ہم غریب ہیں بازارِ عشق میں   کم اس قدر بھی قیمتِ جذبات مت لگا
ہر چند زندگی بھی مصیبت ہے آج کل   پھر بھی صدائے مرگِ مفاجات مت لگا
رودادِ غم میں سادہ بیانی سے کام لے   بحرِ الم میں اِتنے زحافات مت لگا
دامن پہ اس کے داغ نہ لگ جائے اے رقیب!   میلے ہیں تیرے ہاتھ ، اُسے ہاتھ مت لگا
ہر چیز کا مقام الگ ہے جہان میں   ہر چیز پر تُو مہرِ مساوات مت لگا
مشقِ ستم کے واسطے پتھر تلاش کر   دِل پہ مرے نشانے تو دِن رات مت لگا

باقیؔ جو نور ہے تو اُسے آشکار کر
یہ پردہ ہائے ذات سرِ ذات مت لگا

غزل

—پروین نقش—

خواہشِ جاں کو مار کے جینا پڑتا ہے   یعنی سب کچھ ہار کے جینا پڑتا ہے
ہمت ہے تو سامنے آ اور دیکھ مجھے   عشق میں دِل کو وار کے جینا پڑتا ہے
دیکھ یہی ہے دُنیاداری اور ہمیں   سو رنگوں کو دھار کے جینا پڑتا ہے
رفتہ رفتہ جان گئی مَیں دُنیا کو   سہہ کے دُکھ سنسار کے جینا پڑتا ہے

رات تو جیسے تیسے کٹ جاتی ہے نقشؔ
صبح پسِ دیوار کے جینا پڑتا ہے

غزلیں

—تنویر سیٹھی—

ہوائے درد نے جب زخم کو صدا دی تھی
ہماری کم طلبی نے اسے دُعا دی تھی
لہو نچوڑ لیا جب خزاں نے ٹہنی کا
تو فصلِ گُل نے اسے پھول کی قبا دی تھی
میں دشتِ جاں میں بگولے کی طرح بھٹکا ہوں
مری وفا نے مجھے ہجر کی سزا دی تھی
یہ کام تیرا نہیں تھا اے بادِ صبحِ وصال
وہ تو نے کس لیے شمع وفا بجھا دی تھی
میں زندگی کے سفر پر رواں دواں تھا مگر
نہیں ہے یاد کہ کس نے مجھے صدا دی تھی
مجھے منا کے وہ خود مجھ سے ہو گیا ناراض
فصیل ایک گرائی تھی اِک اُٹھا دی تھی
اُداس آنکھوں میں اب رتجگے ہی رہتے ہیں
کہ میں نے خواب کی دولت کہیں لٹا دی تھی

جب اپنے بازو کام نہ دیں کوئی موسم ساتھ نہیں دیتا
بادل نہ ہوا کے ساتھ چلیں ساون برسات نہیں دیتا
ہر صبح سنہری کرنوں سے دھرتی کی مانگ سجاتا ہے
دِن بانٹتا پھرتا ہے گھر گھر یہ سورج رات نہیں دیتا
منصور بھی کیسا انساں تھا کس شان سے دار پہ کہتا تھا
جاں دینا اس کے لیے آساں ہے جو اپنی بات نہیں دیتا
وہ چاند حسین سہی بے شک دھرتی تو اپنی دھرتی ہے
میں چاند کو چاند ہی کہتا ہوں اور تشبیہات نہیں دیتا
کشکول اُٹھائے اس کو میں جینے کی دُعائیں دیتا ہوں
وہ مجھ کو تسلی دیتا ہے لیکن خیرات نہیں دیتا
دھرتی بھی میری بانجھ نہیں پانی بھی وافر ہے تنویر
جو پیڑ لگاتا ہوں میں کیوں وہ پھل اور پات نہیں دیتا

غزلیں

—حسن عباسی—

اِک شخص پاس رہ کے بھی سمجھا نہیں مجھے
اس بات کا ملال ہے ، شکوہ نہیں مجھے

میں اس کو بے وفائی کا الزام کیسے دوں
اس نے تو اِبتدا سے ہی چاہا نہیں مجھے

کیا کیا اُمیدیں باندھ کے آیا تھا سامنے
اس نے تو آنکھ بھر کے بھی دیکھا نہیں مجھے

پتھر سمجھ کے پاؤں کی ٹھوکر پہ رکھ لیا
افسوس تیری آنکھ نے پرکھا نہیں مجھے

کب ٹھیرنا تھا مجھ کو حسنؔ آج اس کے پاس
اچھا ہوا کہ اس نے بھی روکا نہیں مجھے

آہ بن کر تری سانسوں سے نکل آؤں گا
یا کسی روز میں آنکھوں سے نکل آؤں گا

بھول جانا مجھے آسان نہیں ہے اتنا
باتوں باتوں میں ہی باتوں سے نکل آؤں گا

پھر مجھے فیصلہ کرنا ہے کہ جانا ہے کہاں
جب ترے شہر کی گلیوں سے نکل آؤں گا

اب نہ سورج نہ ستاروں سے تعلق میرا
اب ترے دِن تری راتوں سے نکل آؤں گا

شرط اتنی ہے کہ بارش کی طرح آنا تم
دیکھنا کیسے میں شاخوں سے نکل آؤں گا

جب پکارے گا کوئی سبز جزیرے سے حسنؔ
سر پٹختی ہوئی لہروں سے نکل آؤں گا

غزلیں

—خالد ملک ساحل—

کھلنے کو کچھ نہیں ہے تو پھر آسماں کھلے ‏ ‏ اور آسماں کا بھید ، سرِ خاکداں کھلے
کھلنے کو کچھ نہیں ہے تو پھر آسماں کھلے ‏ ‏ لیکن ، فلک کا بھید ، سرِ خاکداں کھلے
اِک آئینہ ہے اور حقیقت نہیں کوئی ‏ ‏ اس کائناتِ فکر میں کیسے گماں کھلے
اِک لمحہ اختیار کا ، وہ بھی نہیں مِلا ‏ ‏ ہم اس جہان پر جو کھلے ناگہاں کھلے
ابرِ سیاہ ، چاند ، یہ کھڑکی یہ آسماں ‏ ‏ گیسو کھلے جو یار کے دیکھو کہاں کھلے
اِک آہ وہ بھی سانس کی مٹھی میں دَب گئی ‏ ‏ حیرت کی واردات کوئی کیسے یاں کھلے
اِک راستہ فرار کا دیکھا تو تھا مگر ‏ ‏ کچھ آشنا قریب تھے ، کچھ رازداں کھلے
چلنے لگیں ہوائیں شمال و جنوب سے ‏ ‏ مشرق بجھا تو درد کے پھر بادباں کھلے

شام و سحر کے پھیر میں کچھ بھی نہیں ہے یار
رکھے ہیں ہم نے ہاتھ میں سود و زیاں کھلے

تقدیر کے دربار میں القاب پڑے تھے ‏ ‏ ہم لوگ مگر خواب میں بے خواب پڑے تھے
یخ بستہ ہواؤں میں تھی خاموش حقیقت ‏ ‏ ہم سوچ کی دہلیز پہ بیتاب پڑے تھے
تصویر تھی احساس کی تحریر ہوا کی ‏ ‏ صحرا میں ترے عکس کے گرداب پڑے تھے
کل رات میں جس راہ سے گھر لوٹ کے آیا ‏ ‏ اُس راہ میں بکھرے ہوئے کچھ خواب پڑے تھے
وہ پھول جنھیں آپ نے دیکھا تھا ادا سے ‏ ‏ اُجڑے ہوئے موسم میں بھی شاداب پڑے تھے

پچیس برس بعد اُسے دیکھ کے سوچا اِک قطرۂ کم ذات میں غرقاب پڑے تھے
ہم لوگ تو اخلاق بھی رد آئے ہیں ساحلؔ
ردّی کے اُسی ڈھیر میں آداب پڑے تھے

میں بھی حضورِ یار بہت دیر تک رہا آنکھوں میں پھر خمار بہت دیر تک رہا
کل شام میرے قتل کی تاریخ تھی مگر دُشمن کا انتظار بہت دیر تک رہا
اب لے چلا ہے دشت میں، میرا جنوں مجھے اِس جن پہ اختیار بہت دیر تک رہا
وہ انکشافِ ذات کا لمحہ تھا کُھل گیا شاید درونِ غار بہت دیر تک رہا
اب دیکھتے ہو کوئی سہارا ملے تمھیں میں بھی تو اشکبار بہت دیر تک رہا
تم مصلحت کہو ، یا منافق کہو مجھے دِل میں مگر غبار بہت دیر تک رہا
میں ، خاک آسماں کی بلندی کو دیکھتا اپنوں پہ اعتبار بہت دیر تک رہا
الزامِ خودسری بھی تو ثابت کیا گیا جب کہ میں خاکسار بہت دیر تک رہا
ساحلؔ مری بلا سے ، مرا حشر ہو گا گیا
دُنیا میں باوقار بہت دیر تک رہا

میں اپنی آنکھ بھی خوابوں سے دھو نہیں پایا میں کیسے دوں گا زمانے کو جو نہیں پایا
شبِ فراق تھی ، موسم عجیب تھا دِل کا میں اپنے سامنے بیٹھا تھا رو نہیں پایا
مری خطا ہے کہ میں،خواہشوں کے جنگل میں کوئی ستارہ کوئی چاند ، بو نہیں پایا
بڑے حسین گلوں سے سجایا تھا ، گھر کو بس ایک پتہ میں دِل سا پرو نہیں پایا
چمک رہے تھے اندھیرے میں سوچ کے جگنو میں اپنی یاد کے خیمے میں سو نہیں پایا
نہیں ہے لفظِ تسلی مگر کہوں ساحلؔ
نہیں جو پایا کہیں یار ، تو نہیں پایا

غزل

—دستگیر قمر—

کب یہ چاہا تھا کوئی بات زباں سے نکلے
پر یہ افسانے مرے اشکِ رواں سے نکلے

ہم ترے تھے تو ہمارا تھا زمانہ سارا
ہم تری بزم سے نکلے کہ جہاں سے نکلے

جانے والے مجھے اتنا تو بتا کر جاتے
ہم ترے دِل سے ،نظر سے کہ گماں سے نکلے

لوگ مجھ کو بھی کہیں شہرِ سخن کا باسی
تو غزل اوڑھ کے جب میرے بیاں سے نکلے

عشق کے راہی قمؔر جیتے ہیں مانندِ قمر
جو بھی ڈوبے ہیں یہاں پرتو وہاں سے نکلے

———

غزل

—ڈاکٹر شکور الرحمٰن—

ٹھہر گئی ہیں اُن آنکھوں کے رُوبرو آنکھیں — لو! دِل کے بعد، ہوئیں اب مری عدو آنکھیں
اُداس شام سی ڈھل جائے چودھویں شب میں — ذرا اُٹھا کے تو دیکھے وہ ماہ رُو آنکھیں
نظر سے اُس کو جواب نظر پسند آیا — چلو! کہیں تو ہوئی ہیں یہ سرخرو آنکھیں
نشاطِ صبح فروزاں وہ ناز میں اَبرو — سرودِ شام غزالاں وہ خوبرو آنکھیں
اُس اِک نگاہ سے نغمے ہزار پھوٹتے ہیں — ستار کھیلتی پلکیں ، وہ خوش گلو آنکھیں
چھپا کہیں بھی ہوں ،لیکن وہ دیکھ لے گا تجھے — وہ ایسا بینا ہے رکھتا ہے چار سو آنکھیں
ہم عشق والوں کا تقدیس حسن مذہب ہے — کبھی ملائیں نہ آنکھوں سے بے وضو آنکھیں
ہر ایک بام و دریچہ نشانِ مقتل ہے — کہاں کہاں سے پھری ہیں وہ فتنہ خو آنکھیں
ہوا کے دوش پہ رقصاں میں کانچ کے ٹکڑے — کہ داغ داغ بدن ہیں لہو لہو آنکھیں

سلا کے ایک نظر سے وہ زخم اَشکوں کے
فقیر کر گئے آنکھوں سے وہ رفو آنکھیں

غزل

—راحت نذیر راحتؔ—

لوٹ کر آیا ہے کوئی اجنبی ، برسوں کے بعد
رنگ لائی ہے ہماری زندگی ، برسوں کے بعد

مَر مٹے تھے جس پہ ہم اِک بار برسوں پیشتر
آ گیا ہے ہم سے ملنے پھر وہی ، برسوں کے بعد

یوں تو اکثر جانے والے لوٹ کر آتے نہیں
میری قسمت نے دِکھائی یہ خوشی ، برسوں کے بعد

کب سے میں رُوٹھی ہوئی تھی خود ہی اپنے آپ سے
ہوگئی ہے خود سے اپنی دوستی ، برسوں کے بعد

ڈھل گئی آخر کو راحتؔ ہجر کی لمبی وہ رات
وصل کے سورج کی نکلی روشنی ، برسوں کے بعد

ہم جو اشعار لیے پھرتے ہیں
غم کا اظہار لیے پھرتے ہیں

ایسا لگتا ہے کہ زندہ اجسام
دوش پر بار لیے پھرتے ہیں

سر میسر ہی نہیں ہیں شاید
لوگ دستار لیے پھرتے ہیں

اِک مسیحا کی طلب میں ہم بھی
کتنے آزار لیے پھرتے ہیں

حالتِ جنگ ہے گویا طاری
لوگ تلوار لیے پھرتے ہیں

کوئی کردار نہیں ہے باقی
صرف پندار لیے پھرتے ہیں

کاش مِل جائے سکونِ خاطر
قلبِ بیزار لیے پھرتے ہیں

دیر سے ہم سرِ بازار ندیمؔ
غم کا انبار لیے پھرتے ہیں

غزلیں

—سرور عالم راز سرور—

زیرِ لب سب کچھ ہے لیکن برملا کچھ بھی نہیں
اِس طرح بیٹھے ہیں وہ جیسے ہوا کچھ بھی نہیں

جام و مینا، ساز و مطرب، رنگِ محفل، لطفِ شعر
یار پہلو میں نہ ہو جب تو مزا کچھ بھی نہیں

صبحِ غم، روزِ جنوں، شامِ اَلم، شب ہائے مرگ
راہِ اُلفت میں دِلا! اِس کے سوا کچھ بھی نہیں

اِک ذرا سی ٹھیس سے تارِ نفس نایاب ہے
اِبتدا کچھ بھی نہ تھی، اب اِنتہا کچھ بھی نہیں

ہر نفس ساغر بکف ہو، ہر گھڑی مینا بدوش
یہ نہیں ہے گر تو جینے میں رکھا کچھ بھی نہیں

عشق اپنی اِبتدا ہے، عشق اپنی انتہا
عاشقی کی رفعتوں سے ماورا کچھ بھی نہیں

اہلِ دِل پر خندہ زن اہلِ خرد ہیں اس طرح
ہو خدائی اُن کی جیسے اور خدا کچھ بھی نہیں

دِل ہوا افسردہ تو نظروں میں بھلا جچتا ہے کیوں؟
بوئے گل، رنگِ سمن، موجِ صبا کچھ بھی نہیں

کھوئی کھوئی سی نظر کیا کیا فسانے کہہ گئی
اور کہنے کو جو پوچھو تو کہا کچھ بھی نہیں

کیا تعجب تجھ سے جو دُنیا ہے سرورؔ بے خبر
بحرِ ہستی میں متاعِ نقشِ پا کچھ بھی نہیں

نکہتِ زلف غزل، شوخیٔ رُخسار غزل
ناز و انداز و اَدا، گرمیٔ رفتار غزل

سوز میں ڈوبی ہوئی، ساز سے سرشار غزل
لے اُڑی ہے ترا لہجہ، تری گفتار غزل

صبحِ اُمید یہی ہمدم و دمساز رہی
شامِ غم بن گئی تھک کر مری غم خوار غزل

کون سمجھائے گا اِس لمحۂ موجود کی بات
یوں تو کہنے کو کہی جائے گی سو بار غزل

خونِ اُمید میں شامِل ہو جو خونِ ہستی
تب کہیں جا کے ہوا کرتی ہے تیار غزل

آئیں اب اہلِ خرد، شامِ جنوں ہوتی ہے
پڑھ رہا ہے کوئی منصور سرِ دار غزل

سرورؔ خستہ نفس ہدیۂ دِل لایا ہے
ایک لمحہ ہی سہی، سن تو لیں سرکار غزل

غزلیں

—سرور ارمان—

سحر و شام میں تنظیم کہاں ہوتی ہے
خواہشِ صبح کی تجسیم کہاں ہوتی ہے

لُوٹ لے جاتا ہے بس چلتا ہے جس کا جتنا
روشنی شہر میں تقسیم کہاں ہوتی ہے

ان محلّوں میں جہاں ہم نے گزاری ہے حیات
مدرسے ہوتے ہیں، تعلیم کہاں ہوتی ہے

شہریاروں نے اجاڑا ہو جسے ہاتھوں سے
پھر سے آباد وہ اقلیم کہاں ہوتی ہے

تیرتے ہیں جو غلاموں کی جھکی آنکھوں میں
ان سوالات کی تفہیم کہاں ہوتی ہے

جس کا اعزاز ترے در کی گدائی ہو اسے
عمر بھر خوئے زر و سیم کہاں ہوتی ہے

ہم غریبوں کی جبیں پر کسی جابر کے حضور
تہمتِ سجدۂ تسلیم کہاں ہوتی ہے

طاق پر عہدِ گزشتہ کو اُٹھا کر رکھ دیں
آ تجھے چشمِ زمانہ سے چھپا کر رکھ دیں

کن بہاروں سے در و بام کی تزئین کریں
کتنی شمعیں ترے رستے میں جلا کر رکھ دیں

ہوش مندی ہے یہ کیا قریۂ عشاق میں لوگ
ہر جگہ ایک ہی تصویر بنا کر رکھ دیں

غمِ جاناں غمِ دوراں میں سمٹ جاتا ہے
جب چراغوں کو سرِ شام بجھا کر رکھ دیں

پردۂ ذہن پہ محفوظ رہے نقش تمام
ہم نے چاہا تو بہت تھا کہ مٹا کر رکھ دیں

کب کوئی مانگتا ہے ایسی بہاروں کی دعا
آگ جو ایک رگ و پے میں لگا کر رکھ دیں

خواب بکتے نہیں بازار میں دُکانوں پر
اپنے بے خواب دریچے میں جو لا کر رکھ دیں

چلو ویرانے کو تنہائی سے آباد کریں
شہر سے دور کہیں شہر کو جا کر رکھ دیں

غزلیں

—سعداللہ شاہ—

احسان مند ہم رہے بادِ شمال کے
لائی جو اس کی یاد کو خوشبو میں ڈھال کے

اس خوبرو نے خواب کو تجسیم کر دیا
کیا خدوخال ابھرے ہیں میرے خیال کے

حیرت زدہ ہے آنکھ میں اک دشتِ بے اماں
وہ لے گیا ہے دل سے سمندر نکال کے

پلکوں پہ جو ستارے چنیں صبحِ نو تلک
لاؤ کہیں سے آدمی اپنی مثال کے

اسبابِ جاں کو ہار کے اک اور صبر اب
ٹوٹے پڑے ہیں بند سبھی اپنے جال کے

ہم لاجواب ہو کے اسے دیکھتے رہے
ورنہ جواب کتنے تھے اس کے سوال کے

سچ پوچھیے تو اپنی نظر میں ثواب تھے
ہیں کچھ گناہ ایسے بھی اپنے مآل کے

آنکھیں چرا رہے ہیں اب اپنے ضمیر سے
ہم اپنے نکتہ چیں کو جو آئے ہیں ٹال کے

کچھ اور بھی حسین ہوئی اپنے غم کی شام
رنگ آ ملے زوال میں اپنے ملال کے

ایسا نہیں کہ ہجر کی تمہید کچھ نہ تھی
دو چار دن ملے تھے ہمیں بھی وصال کے

اپنے قدم نہ جم سکے اے سعدؔ چاند پر
ورنہ دکھاتے ہم بھی زمیں کو اچھال کے

سکوں نہیں ہے میسر مجھے وطن میں کہیں
دہک رہی ہے کوئی آگ سی بدن میں کہیں

مجھے ہے حکمِ اذاں اور اس پہ لازم بھی
خدا کا ذکر نہ آئے مرے سخن میں کہیں

وہ کیف جو کہ میسر نہیں ہے پھولوں میں
رکھا گیا ہے فقط خار کی چبھن میں کہیں

گھٹن ہے وہ کہ کوئی سانس بھی نہیں لیتا
چراغ جاں ہی نہ بجھ جائے اس گھٹن میں کہیں

وہ اک مہک مرے سینے ہی سے ہویدا ہوئی
میں سوچتا تھا جسے نافۂ ختن میں کہیں

عجیب وحشتِ حرص و ہوس ہے وقتِ وصال
کہ ٹانکتے ہیں کئی جیب سی کفن میں کہیں

یہ احترامِ محبت کا اک قرینہ ہے
چھپا دیا ہے اسے میں نے فکر و فن میں کہیں

میں ڈر رہا ہوں کنارا کہیں سے ٹوٹے گا
مچل رہا ہے سنامی سا میرے من میں کہیں

مجھے خبر تھی کہ منزل کوئی نہیں میری
کمی نہ آئی ذرا سی مگر لگن میں کہیں

غزلیں

—سیّد اذلان شاہ—

سب کو دیتی ہے دکھائی نظر آنے کے لیے
کیا نہیں کرتی خدائی نظر آنے کے لیے

ہم کہ گزرے ہوئے لوگوں کو بہت روتے ہیں
ہم کہ دیتے ہیں دہائی نظر آنے کے لیے

کیا تعلق کا پتہ چلتا نہیں قربت سے
کیا ضروری ہے جدائی نظر آنے کے لیے

سبھی کھاتے ہیں دِکھاوے کی کمائی صاحب
سبھی کرتے ہیں بھلائی نظر آنے کے لیے

جو چراغ ایسے نہیں بنتے تو خواب ایسے بنو
کچھ تو کر لو مرے بھائی نظر آنے کے لیے

خاک میں دفن خزانوں کی طرف دیکھتا ہوں
میں بھی ان دیکھے جہانوں کی طرف دیکھتا ہوں

کوئی خامی نہ لگے حسن مکمل میں تو پھر
ناچتے ناچتے پیروں کی طرف دیکھتا ہوں

لوگ جب بات کریں اور کریں مرشد کی
میں عقیدت سے چراغوں کی طرف دیکھتا ہوں

کارِ اُلفت بھی ضرورت کی طرح ہے مجھ کو
وقت پڑنے پہ بزرگوں کی طرف دیکھتا ہوں

پہلے خوش ہوتا ہوں خوش دیکھ کے اوروں میں اُسے
پھر کہیں پاؤں کے چھالوں کی طرف دیکھتا ہوں

مارا جائے گا کہیں رکھ کے اندھیرے میں مجھے
مجھ پہ شک ہے کہ چراغوں کی طرف دیکھتا ہوں

غزلیں

—سیّد انصر—

ظرف ایسا ہے ستم سہہ کے بھی کم بولتے ہیں
موجِ خوں سر سے گزرتی ہے تو ہم بولتے ہیں

یاں کسی شخص کو تہذیبِ تکلم ہی نہیں
کیسی محفل ہے کہ سب لوگ بہم بولتے ہیں

عشق والے کبھی گمنام نہیں رہ سکتے
یہ وہ رستا ہے جہاں نقشِ قدم بولتے ہیں

یہ الگ بات کہ اظہار نہیں کرتے لوگ
مسکراتی ہوئی آنکھوں میں بھی غم بولتے ہیں

اُن کو کیا بولنا ہوتا ہے کسی محفل میں
جن کی پیشانی پہ تقدیر کے خم بولتے ہیں

جنگ میں اور تو کوئی بھی مرے حق میں نہ تھا
دست و بازو تھے سو ہو کر بھی قلم بولتے ہیں

میری سچائی کا غماز ہے یہ سناٹا
جس طرح اُونچی فصیلوں پہ علم بولتے ہیں

نہیں کہ صرف ہمارے ہی بام و در چپ ہیں
اُداسیاں ہیں کچھ ایسی گھروں کے گھر چپ ہیں

وہ اس گمان میں تھا لب کشائی سے پہلے
بدن کی شاخ سے کٹ کر ہمارے سر چپ ہیں

ملاپ ہونے نہ دے گا طبیعتوں کا تضاد
یہ بات دونوں کو معلوم ہے مگر چپ ہیں

نجانے کیسی قیامت کا سامنا ہے انھیں
امیر قافلہ خاموش ہمسفر چپ ہیں

غریب لوگ بہت ناتواں سہی انصرؔ
یہ بے زباں تو نہیں کیا ہوا اگر چپ ہیں

اِک رنگ روشنی سے جدا ہے چراغ میں
لگتا ہے کوئی جلوہ نما ہے چراغ میں

لو تھرتھرائی تھی کہ میں سجدے میں گر پڑا   اِک وہم سا ہوا تھا خدا ہے چراغ میں
سینے میں جگمگاتا ہے دِل، دِل میں تیرا عشق   گویا کوئی چراغ رکھا ہے چراغ میں
ڈٹ تو گیا ہے تیز ہواؤں کے سامنے   اب دیکھنا ہے کتنی اَنا ہے چراغ میں
ظلمت زدہ مکان ہوں یہ جانتا ہوں میں   میرے سبھی دُکھوں کی دوا ہے چراغ میں
شعلے کی ہر لپک میں جھلک ہے جمال کی   یہ کون آ کے بیٹھ گیا ہے چراغ میں
کھنچتے ہیں شام ہی سے دِل و دیدہ اُس طرف   اعجاز ہے کرشمہ ہے کیا ہے چراغ میں

انصؔر کچھ اس طرح سے لپکتی ہیں آندھیاں
جیسے کوئی خزانہ چھپا ہے چراغ میں

اِسی لیے تو نہیں کر رہا نمو کوئی اور   چمن کی خاک کو درکار ہے لہو کوئی اور
کچھ اتنا سہل نہ تھا سر بلند ہو جانا   ہماری طرح کٹاتا رگِ گلُو کوئی اور
میں شر کے بڑھتے ہوئے ہاتھ روکنے سے رہا   سو چاکِ دامنِ یزداں کرے رفو کوئی اور
مذاق اُڑایا یہ کہہ کر مری شہادت کا   یہ پیرہن ہے کسی اور کا لہو کوئی اور
نمازِ عشق کسی اور کو نصیب ہوئی   فراتِ حرص پہ کرتا رہا وضو کوئی اور
زمینِ دشتِ بلا خوب جانتی ہے ہمیں   نہ میں ہی اور کوئی شخص ہوں نہ تو کوئی اور

دُعا کو ہاتھ اُٹھائے نہ اس لیے انصؔر
تمہارے بعد نہ کرنی تھی آرزو کوئی اور

غزل

— شکیل سالک —

اُداس شام میرے گھر میں آ نہ جائے کہیں
درِ خیال پہ حسرت سی چھا نہ جائے کہیں

خدا کرے کہ رہے اُس کی آرزو دِل میں
یہ آرزو کوئی بجلی گرا نہ جائے کہیں

تم اس قدر بھی نہ چاہو کسی ستم گر کو
کہ اُس کے ہجر میں تم سے رہا نہ جائے کہیں

کبھی تو اُس کی تمنّا میں مَیں بھی شامِل تھا
اب اُس کا نام بھی مجھ سے سنا نہ جائے کہیں

ہر ایک شخص کو دیتا ہے وہ متاعِ نشاط
یہی ہے ڈر کہ وہ مجھ کو بُھلا نہ جائے کہیں

تمام شہر نے کھولے ہوئے ہیں دروازے
وہ میرے گھر کے سواء اے خدا نہ جائے کہیں

کوئی جو پوچھ لے مجھ سے شکیؔل کیسے ہو
تو مجھ سے حال بھی اپنا کہا نہ جائے کہیں

غزلیں

— شکیل سروشؔ —

یا مرے رِستے ہوئے زخموں کو اچھا کر دے
یا پھر ان زخموں کو پہلے سے زیادہ کر دے

رُوح کا بوجھ اُٹھانا نہیں ممکن اب تو
اے خدا اب مجھے کاغذ سے بھی ہلکا کر دے

اس سے رکھنا ہے اگر دُور تو پھر میرے خدا
اس سے بہتر ہے مجھے آنکھوں سے اندھا کر دے

میں اگر پانی ہوں تو آگ کی مانند ہے وہ
تجھ سے ممکن ہے تو اِن دونوں کو یکجا کر دے

اس کی راہوں میں بکھر جاؤں گلابوں کی طرح
اے خدا تو مرے اس خواب کو سچا کر دے

موم بن کر نہ پگھل جاؤں کہیں رستے میں
اپنے سورج کا تو سر پر مرے سایا کر دے

تجھ سے کب میں نے یہ زخموں کی قبا مانگی تھی
میں نے کب تجھ سے کہا تھا مجھے ایسا کر دے

میرا غم خوار ہے مونس ہے مرا دوست ہے تو
مجھ کو دُنیا کی نگاہوں میں تو رُسوا کر دے

تیرا ہر زخم مجھے لگتا ہے پھولوں کی طرح
ان ہی پھولوں سے مزین مرا چہرہ کر دے

جہاں تک جاتے ہوئے سانس بکھر جائے مری
اس قدر دُور نگاہوں سے کنارا کر دے

چھوڑ دے مجھ کو مرے حال پہ اے جانِ سروشؔ
اس زمانے میں تو پھر سے مجھے تنہا کر دے

غزلیں

—شہزاد احمد—

رات افسردہ ہوئی دیکھ کے حالت میری
پھر بھی حیرت ہے کہ ہستی ہے سلامت میری

اپنے غم لوگوں میں تقسیم کیے جاتا ہوں
مجھے کنگال نہ کر دے یہ سخاوت میری

یہ زمانہ تو سمجھ میں نہیں آنے والا
کسی شب مجھ کو نگل جائے گی حیرت میری

میں ہواخوری کو گلشن میں چلا آیا تھا
اور صبا لوٹ گئی دیکھ کے صورت میری

میں نے اک خط کسی بے نام پتے پر بھیجا
آپ بھی تو نہیں سنتے تھے شکایت میری

میں اب ان خاک کے ذروں کو سمیٹوں کیسے
منظروں کی طرح بکھری ہے محبت میری

اب تو اُٹھنے نہیں دیتی ہے زمینوں سے مجھے
آسمانوں پہ نہ لے جائے نقاہت میری

مجھ کو معلوم ہے یہ بات بتانے کی نہیں
آپ محسوس تو کرتے ہیں ضرورت میری

آئے گی چار طرف سے تری آواز کی گونج
ختم ہو جائے گی جس روز سماعت میری

میں یہ سمجھا تری دیوار کا سایا ہی نہیں
سارا منظر تو مری آنکھ تک آیا ہی نہیں

فیصلہ کیسے ہو ، موجود ہوں یا ناموجود
تو نے تو ہونے کا احساس دلایا ہی نہیں

منزلیں چاروں طرف دل نے بنا رکھی ہیں
کس طرف جانا ہے یہ تو نے بتایا ہی نہیں

ایک جگنو مرے کمرے میں اتر آیا تھا
صبح تک کوئی دیا میں نے جلایا ہی نہیں

جتنی تصویریں ہیں سب ایک سی لگتی ہیں مجھے
کوئی منظر مری آنکھوں میں سمایا ہی نہیں

مختلف زاویوں سے دیکھتا ہوں دنیا کو اور یہ جرم کبھی میں نے چھپایا ہی نہیں

یہ الگ بات کہ اس کو بھی گنوا بیٹھا ہوں
وہ خزانہ جو مرے ہاتھ میں آیا ہی نہیں

آن پہنچی ہے وہ شب راہ سجھانے والی اب ہوا آئے چراغوں کو بجھانے والی
تو کسی کوکب و مہتاب سے کچھ کم تو نہیں اے زمیں! تو بھی ہے مٹی کے خزانے والی
میں بھی اسرار کے کچھ لعل و گہر رکھتا ہوں ہے مرے پاس بھی اک بات چھپانے والی
جس قدر رودیئے یاد اس کی فزوں ہوتی ہے یعنی یہ موج نہیں نقش بنانے والی
ایک لہراتا ہوا سایہ نظر آتا ہے جاگ اٹھتی ہے حویلی وہ پرانے والی
جس ستارے سے چلی تھی کہیں موجود نہیں روشنی اب تو نہیں لوٹ کے جانے والی
رکتی جاتی ہیں ہوائیں کوئی تدبیر کرو کرّۂ ارض کو انگلی پہ گھمانے والی

اپنی فطرت میں ہوں چیتے کی طرح میں سفاک
کوئی طاقت ہے مجھے مجھ سے بچانے والی

غزلیں

—شہزاد اسلم—

رنگ اس حسن کے کچھ راہگزر تک پہنچے — آج شاید ہی سلامت کوئی گھر تک پہنچے
شہریاروں پہ رقابت کے وہ پہرے ہیں لگے — کیا مجال اُن کو محبت کی خبر تک پہنچے
کبھی سوچا بھی ہے کیوں جل اُٹھے یہ پھول سے جسم — لوگ یہ پھول سے کیوں رقصِ شرر تک پہنچے
ایک طائر جو فضاؤں میں ابھی چھوڑا ہے — نہیں معلوم یہ کب اُس کی نظر تک پہنچے
شاید آ جائے وہ خود ہی کبھی ملنے شہزاؔد
کچھ اشارے تو اِدھر کے ہیں اُدھر تک پہنچے

وہ نور ہو کہ چراغاں گلی گلی ہو جائے — جو چاہتے ہیں میاں ہم، اگر وہی ہو جائے
یہ ایک لمحہ نہیں ہے، یہ ہجر کا اک پل — گزارنے جو لگو صرف زندگی ہو جائے
تمھیں اندھیروں کا کیا ڈر جو کھول دو گیسو — حسد سے جل اُٹھے شب اور روشنی ہو جائے
ملے بغیر تمھیں خوش ہوں، کیسے ممکن ہے؟ — کہ چاند بھی نہ نظر آئے عید بھی ہو جائے
بچھڑنا ملنا تو صدیوں سے ہوتا آیا ہے — محبتوں میں کوئی بات اب نئی ہو جائے
عجب نہیں سبھی ڈر جائیں گہرے پانیوں سے — اگر نگاہوں سے اوجھل وہ جل پری ہو جائے
کسی کی چیخیں سنائی نہ دیں یہاں شہزاؔد
کسی کے ہونٹ ہلیں اور ان کہی ہو جائے

غزلیں

—شیخ اعجاز—

غم سے نڈھال ہے جو بشر اُس سے پوچھیے ہوتا ہو خون جس کا جگر اُس سے پوچھیے
تسبیح جو کرے ہے بشر اُس سے پوچھیے لائے دُعا نہ پھر بھی اثر اُس سے پوچھیے
کشتی ہو جس کی بیچ بھنور اُس سے پوچھیے سوئے فلک ہو جس کی نظر اُس سے پوچھیے
کوشش نہ جس کی لائے ثمر اُس سے پوچھیے آئے نہ کام جس کا ہنر اُس سے پوچھیے
ہوں دربدر کی ٹھوکریں جس کے نصیب میں جس کا نہ ہو کہیں کوئی گھر اُس سے پوچھیے
مُدّت کے بعد جس کو رہائی ملے ، مگر!! کٹ جائیں اِس سے پہلے ہی پر اُس سے پوچھیے
کیا اُس کی زندگی ہے کہ منزل سے دُور ہی ہو ختم جس کا زادِ سفر اُس سے پوچھیے
مخلص نہ جس کا ہو کوئی اعجاؔز شہر میں
رکھے کوئی نہ جس کی خبر اُس سے پوچھیے

جب سیلِ غم میں لوگ بکھرتے چلے گئے! اپنے نصیب اور سنورتے چلے گئے!
خود اپنے مسئلوں کا سبب آپ تھے وہ لوگ الزام دوسروں پہ جو دھرتے چلے گئے
کچھ بات دِل کی اُس نے کہی اتنے پیار سے الفاظ دِل کے پار اُترتے چلے گئے
طوفاں نے چاہا لاکھ ڈبونا ہمیں مگر ہم پر ترا کرم کہ اُبھرتے چلے گئے
مانگیں دُعائیں ہم نے جو اوروں کے واسطے بگڑے ہوئے کام سدھرتے چلے گئے
تم نے تو ڈھیل کوئی نہ چھوڑی مگر اے دوست اچھے ہی دِن ہمارے گزرتے چلے گئے

مرنے کی آرزو لیے جیتے رہے ہیں ہم — جو جینا چاہتے تھے وہ مرتے چلے گئے
ہم پر تھیں جن کی پہلے ہی کافی نوازشیں — احسان اور ہم پہ وہ دھرتے چلے گئے
اعجاؔز آ گئے وہ عیادت کو جب مری
زخموں کے پھول اور نکھرتے چلے گئے

لے کر تو کچھ نہ جائے گا ناداں سمیٹ کر — پھر کیا کرے گا بول یہ ساماں سمیٹ کر
تخلیق کی تھی شرط کہ دُنیا میں آدمی — دامن میں لا کے ڈالے گا خوشیاں سمیٹ کر
کوشش تو گلستان پہ قبضے کی تھی مگر — لائے وہاں سے چند ہی کلیاں سمیٹ کر
لالچ ، دغا ، فریب ، تکبر فساد و جنگ! — لایا ہمارے واسطے شیطاں سمیٹ کر
راہِ نجات کیسے بھلا اب ہمیں ملے — رکھا ہے ہم نے طاق میں قرآں سمیٹ کر
میری بجائے اُس کو پذیرائی مِل گئی — وہ گھر سے لے گیا میرا دیواں سمیٹ کر
اے کاش آخرت کا جو کرتے خیال تم
اعجاؔز لے کے جاتے نہ عصیاں سمیٹ کر

آ کر میں سرِ راہ گزر بھول گیا ہوں — آگے مجھے جانا ہے کدھر بھول گیا ہوں
پھولوں کی طرح لفظ پروتا ہوں شعر میں — سیکھا کہاں سے ہے یہ ہنر بھول گیا ہوں
منزل کا عزم کر کے ہی نکلا تھا گھر سے میں — پر چلتے چلتے اپنی ڈگر بھول گیا ہوں
مصروف اتنا کر دیا افکار نے مجھے — سارے حسین شام و سحر بھول گیا ہوں
دھڑ ساتھ لے کے آ گیا ہوں اپنے گھر کو میں — پر جنگ کے میدان میں سر بھول گیا ہوں
رستے میں، میں نے چاند کی دیکھی جو اِک جھلک — ہائے میں اپنا اگلا سفر بھول گیا ہوں
سب کو حقیر اپنے سوا جانتا ہوں میں — گو خود ہوں ایک ادنیٰ بشر بھول گیا ہوں
اعجاؔز خود ہی اپنے مٹا ڈالے نقشِ پا
کیسے ملے گی اُس کو خبر بھول گیا ہوں

غزلیں

—ضیاء پرویز—

کیا کہیں، ٹکڑوں میں کیسے بٹ رہی ہے زندگی
رفتہ رفتہ نفرتوں سے اَٹ رہی ہے زندگی

یہ ہمارا حوصلہ ہے ٹوٹ کر بکھرے نہیں
گو ہماری حادثوں میں کٹ رہی ہے زندگی

لوگ سارے کر رہے ہیں زندگی کی آرزو
پھر بھی اُن کی راہ سے کیوں ہٹ رہی ہے زندگی

آج بھی ہم چاہتوں کی جنگ میں تنہا نہیں
آج بھی یہ ساتھ اپنے ڈٹ رہی ہے زندگی

درد کی اِک داستاں تھی گو ہمارے واسطے
اُن کی خاطر پیار میں یہ گھٹ رہی ہے زندگی

کس سے پوچھے اب ضیاؔء یہ زندگی کا راز کیا
موت بڑھتی جا رہی ہے گھٹ رہی ہے زندگی

کون ہے جو خواب آنکھوں میں سجاتا ہے یہاں
ہر کوئی تو خواب اپنے توڑ جاتا ہے یہاں

ہم تو خود سے بھی کبھی رُوٹھے نہیں اِس خوف سے
کون ہے رُوٹھے ہوؤں کو جو مناتا ہے یہاں

اِس جہاں کو خوب سے ہے خوب تر کی آرزو
دِل کسی کا بھی ہو فوراً ٹوٹ جاتا ہے یہاں

ایک مُدّت ہو گئی ہے پتھروں کے شہر میں
اُس سے پوچھو کس کو آخر آزماتا ہے یہاں

اُس سے پوچھو اب ضیاؔء تم روشنی کی قدر زر
روشنی کے واسطے جو گھر جلاتا ہے یہاں

غزلیں

—ظفر اقبال—

خود سے حساب اپنا چکانے تو دے مجھے
میں ناگوار ہی سہی ، جانے تو دے مجھے

مجھ کو بھی ناپسند ہے اِس دل کی روشنی
یہ آخری چراغ بجھانے تو دے مجھے

شائد ہمیں بھی آن پڑے اِس سے کوئی کام
دُنیا سے رسم و راہ بڑھانے تو دے مجھے

سچا بھی عشق ہے تو مزیدار کیوں نہیں
تھوڑا سا اِس میں جھوٹ ملانے تو دے مجھے

اِس عمر میں بھی ساتھ جو دیتی ہے یہ ہوا
جیسی بھی ہے پتنگ اُڑانے تو دے مجھے

سونا نہیں تو یہ تری مرضی کی بات ہے
بستر پہ اپنا آپ بچھانے تو دے مجھے

ہیں زندگی کے ساتھ ہی سارے معاملات
دشمن کو ڈوبنے سے بچانے تو دے مجھے

تسلیم اُسے کرے نہ کرے کوئی میرے پاس
جو معجزہ ہے اُس کو دکھانے تو دے مجھے

تو خود ہی سدِّ راہِ تماشا نہ ہو ظفرؔ
پردہ یہ درمیاں سے ہٹانے تو دے مجھے

جو میرے خانہ دل میں کبھی مکیں تھا وہ
نہیں بھی تھا تو کم از کم یہیں کہیں تھا وہ

اب آسمان ہوا ہے تو دور ہے مجھ سے
کہ اُس سے رابطہ رہتا تھا زمیں تھا وہ

رہا یہاں پہ تو سب لوگ تھے تہی پہلو
کوئی پتہ نہ چلا کس کا ہم نشیں تھا وہ

کچھ اِتنی بھیڑ تھی ، مجھ کو نظر نہیں آیا
اگرچہ میں جہاں موجود تھا وہیں تھا وہ

ہے اُس کے ہونے نہ ہونے کا شک مجھے بھی بہت
اگر وہ تھا بھی کہیں اِس قدر نہیں تھا وہ

کسی نے مان کے ہی شہر میں دیا نہ اُسے
اگر وہ تھا بھی تو بس اپنے ہی تئیں تھا وہ

کہ درمیاں میں ہی ممکن تھا اُس کا ہونا بھی　　نہ پیش ازیں تھا یہاں پر نہ بعد ازیں تھا وہ
جسے پلائے رکھا میں نے دل کا دودھ ظفرؔ
میں جانتا تھا کوئی مار آستیں تھا وہ

ممکن نہیں آدھے سے تو سارے سے نکلتا　　مطلب کوئی پیغام تمہارے سے نکلتا
کہنے سے ترے خلق اگر گھر سے نکلتی　　پھر میں بھی ترے ایک اشارے سے نکلتا
میں نے جسے دیکھا ہی نہیں ٹھیک اُسی شام　　وہ چاند سرِ بام دوبارے سے نکلتا
بیکار دھواں چھوڑتی رہتی ہے محبت　　شعلہ بھی کسی روز ہمارے سے نکلتا
پتھر سے شرارے تو نکلتے رہے اکثر　　اب کے کوئی پتھر بھی شرارے سے نکلتا
افلاک ہیں اتنے پسِ افلاک تو آخر　　ایک اور ستارہ بھی ستارے سے نکلتا
میں ڈوبتا رہتا تھا بہت بیچ سمندر　　لیکن جو نکلتا تو کنارے سے نکلتا
گم ہو گیا ہوتا کہیں موجوں ہی کے اندر　　میں خود نہ اگر خواب کے دھارے سے نکلتا
دھویا گیا ہوتا ظفرؔ ایسا اُسی لمحے
وہ لفظ اگر شرم کے مارے سے نکلتا

دریاؤں کا پانی جو روانی سے نکلتا　　کچھ تو ترا کردار کہانی سے نکلتا
کیا اس کے علاوہ بھی کوئی اور نتیجہ　　بازارِ تماشا کی گرانی سے نکلتا
مٹی سے گیا میں، ہوا مٹی سے برآمد　　ہوتا ہی جو پانی میں تو پانی سے نکلتا
میں آپ ہی اچھا نہیں سمجھا ہوں وگرنہ　　زندہ ہی ترے عالمِ فانی سے نکلتا
جاتا میں ترے ایک اشارے ہی سے واپس　　گھر سے بھی تری یاد دہانی سے نکلتا
ہوتے کوئی مجھ پر بھی بڑھاپے کے نشانات　　میں بھی جو کبھی خوابِ جوانی سے نکلتا
بے نام ہی مرنا تھا مجھے ، ورنہ کہیں پر　　کوئی تو نشاں میری نشانی سے نکلتا
اے کاش وہ ڈوبا ہوا لفظوں کا سفینہ　　اِک دن تو کبھی موجِ معانی سے نکلتا
کچھ غور تو کرتے ظفرؔ احباب کسی طور
کچھ تو مری آشفتہ بیانی سے نکلتا

غزلیں

—ظفر عجمی—

دلِ انساں میں سما سکتے ہو؟ معجزہ ایسا دِکھا سکتے ہو؟
مو قلم خاک پہ رکھ سکتے ہو؟ نقشِ انساں بنا سکتے ہو؟
چومتے ہیں جو تمہارے پاؤں ان کو پلکوں پہ بٹھا سکتے ہو؟
پھونک سکتے ہو کوئی ایسا طلسم؟ رُوٹھے لوگوں کو منا سکتے ہو؟
پوچھوں اے پیرِ کرامات اِک بات کسی روتے کو ہنسا سکتے ہو؟
لوگ کھنچتے چلے آتے ہیں یہاں خود بھی چل کر کہیں جا سکتے ہو؟
شرح و تنقید سے ہاتھ آتی نہیں زیست اِک راز ہے ، پا سکتے ہو؟
تم نے کیا آگ چرانی ہے میاں آنکھ سے خواب چُرا سکتے ہو؟
جھک نہیں سکتے کسی کی خاطر ہاتھ تاروں سے مِلا سکتے ہو
اس تحیر کے سوا بھی کچھ ہے بات تو اچھی سنا سکتے ہو
اس تصرف کے تو ہم قائل ہیں بات سے آگ لگا سکتے ہو
ہو برسنے کی اگر دِل میں تڑپ ابر بن سکتے ہو ، چھا سکتے ہو
داستاں ختم نہیں ہوتی یہاں بات تم آگے بڑھا سکتے ہو

زرنگاروں میں سلامت رہو تم
تم ظفؔر تک نہیں آ سکتے ہو

غمِ جاں ، اب غمِ جہاں ہی سہی رائیگاں ہے تو رائیگاں ہی سہی

کچھ تو اثبات کر محبت کا	داستانِ گزشتگاں ہی سہی
بات یہ انقلابِ وقت کی ہے	کچھ عیاں اور کچھ نہاں ہی سہی
چیخ ممکن نہیں جو ، آہ تو کھینچ	آگ ممکن نہیں ، دھواں ہی سہی
روشنی کی کوئی سبیل تو ہو	چل بہ اندازِ داستاں ہی سہی
سب سے پیچھے ہوں میں مری منزل	خاکِ پائے مسافراں ہی سہی
نہ سہی آفتاب حشر کوئی	اِک نگاہ شرر فشاں ہی سہی
بات ہے صبحِ نو کی ہے تو سہی	میرے اور اُس کے درمیاں ہی سہی
آج پہلی اُڑان ہے میری	آج یہ پہلا آسماں ہی سہی
اِک مدینہ ہے باہر ، اِک دِل میں	اِک یقیں اور اِک گماں ہی سہی

گل و لالہ نہیں ظفؔر تو کیا
نہ سہی ، اشک خوں چکاں ہی سہی

شاخ سرسبز سے جھڑا ہوں میں	سیڑھیوں میں پڑا ہوا ہوں میں
کیوں پریشاں ہے؟ شام کے سورج	تو بجھا ہے تو جل پڑا ہوں میں
شہر نابینا میں اے آئینو	تم نے دیکھا ہے صرف ، کیا ہوں میں
ہاں محبت ہے ہاں محبت ہے	تم سے سو بار کہہ چکا ہوں میں
دُکھ بہت ہے ترے نہ ہونے کا	یہ کمی سب میں بانٹتا ہوں میں
کہکشاں بجھ گئی ترے غم کی	راکھ بیٹھا کُریدتا ہوں میں
وقت کی طرح اُڑتا جاتا ہوں	آتشِ شوق زیرپا ہوں میں
اے کسی ساحلِ وصال کے خواب	پانیوں میں گِھرا ہوا ہوں میں

میں دیا ہوں ظفؔر محبت کا
شہر میں تنہا جل رہا ہوں میں

غزل

—عاصم اقبال عاصمؔ—

ہمارے حال پر اُن کی عنایت ہوتی جاتی ہے
ہمیں درد و الم سے جو، یہ رغبت ہوتی جاتی ہے

خدا رکھے ہمیں ثابت قدم راہِ محبت میں
ہمیں بھی اُس پری پیکر سے اُلفت ہوتی جاتی ہے

اُنھیں ہونے لگا احساس اپنی غفلتوں کا اب
اُنھیں اپنے کیے پر خود ندامت ہوتی جاتی ہے

وہ دیکھو، دشتِ کربل میں علیؓ کے لال کو عاصم!
کہ نیزے پر ہے سر لیکن تلاوت ہوتی جاتی ہے

غزلیں

—عمران شناور—

کچھ تو اے یار! علاجِ غمِ تنہائی ہو
بات اتنی بھی نہ بڑھ جائے کہ رُسوائی ہو

ڈوبنے والےتو آنکھوں سےبھی کب نکلے ہیں
ڈوبنے کے لیے لازم نہیں ، گہرائی ہو

جس نے بھی مجھ کو تماشا سا بنا رکھا ہے
اب ضروری ہے وہی آنکھ تماشائی ہو

میں محبت میں لٹا بیٹھا ہوں دِل کی دُنیا
کام یہ ایسا بھی کب ہے کہ پذیرائی ہو

کوئی انجان نہ ہو شہرِ محبت کا مکیں
کاش ہر دِل کی ہر اِک دِل سے شناسائی ہو

آج تو بزم میں ہر آنکھ تھی پُرنم جیسے
داستاں میری کسی نے یہاں دُہرائی ہو

میں تجھے جیت بھی تحفے میں نہیں دے سکتا
چاہتا یہ بھی نہیں ہوں تری پسپائی ہو

یوں گزر جاتا ہے عمرانؔ ترے کوچے سے
تیرا واقف نہ ہو جیسے کوئی سودائی ہو

———

غزل

—فاروق ماہر—

موضوع خوش جمال سے آگے کی بات ہو
وہ آئیں تو وصال سے آگے کی بات ہو

خوں رنگ داستاں میں اگر اور کچھ نہیں
زخموں کے اندمال سے آگے کی بات ہو

مُدّت سے منتظر ہوں اسی ایک بات کا
کب حُسنِ لازوال سے آگے کی بات ہو

بے شک ہماری گفتگو سنتا نہیں کوئی
پھر بھی درِخیال سے آگے کی بات ہو

مانا وہ خوش نوا ہے مگر ناقدینِ شہر
کوئی تو اِس مثال سے آگے کی بات ہو

تم نے کہا تو آ گئے ہیں مے کدے میں ہم
اب لذتِ حلال سے آگے کی بات ہو

فاروقؔ بزمِ ہجر ہے ایسی غزل کہو
ہر شعر میں ملال سے آگے کی بات ہو

غزلیں

—فرتاش سیّد—

مَیں اپنے دِل کی طرح آئنہ بنا ہوا ہوں
سو حیرتوں کے لیے مسئلہ بنا ہوا ہوں

پہنچ تو سکتا تھا منزل پہ میں مگر اے دوست
میں دوسروں کے لیے راستہ بنا ہوا ہوں

مَیں جب چلا تھا تو اپنے بھی مجھ کو چھوڑ گئے
اور آج دیکھ لو مَیں قافلہ بنا ہوا ہوں

ستم تو یہ ہے کہ ہے میری داستاں اور میں
شریکِ متن نہیں حاشیہ بنا ہوا ہوں

کبھی تھا قیسؔ، کبھی میرؔ اور اب فرتاشؔ
سلوکِ عشق کا اِک سلسلہ بنا ہوا ہوں

گندھ کے مٹی جو کبھی چاک پہ آ جاتی ہے
بات بے مہریٔ افلاک پہ آ جاتی ہے

آسمانوں پہ اُڑو، ذہن میں رکھو کہ جو چیز
خاک سے اُٹھتی ہے، وہ خاک پہ آ جاتی ہے

رنگ و خوشبو کا کہیں کوئی کرے ذِکر تو بات
گھوم پھر کر تری پوشاک پہ آ جاتی ہے

بکھرا بکھرا سا ہے اندازِ تکلم اُن کا
اور تہمت مرے ادراک پہ آ جاتی ہے

نخل محفوظ رہیں، بادِ حوادث جو چلے
ایک آفت خس و خاشاک پہ آ جاتی ہے

چھوڑ جائے جو کوئی چاہنے والا فرتاشؔ
زندگانی رہِ سفاک پہ آ جاتی ہے

جو ہم سے جیسا تعلق نبھائے بسم اللہ
عدو ہو، دوست ہو، جو بھی ہو آئے بسم اللہ

دیارِ عشق میں کوئی بھی روک تھام نہیں
خوش آمدید جو آئے، جو جائے بسم اللہ

کسی دباؤ میں ہم فیصلہ بدلتے ہیں
زمانہ آئے ہمیں آزمائے بسم اللہ

ضرور اُس نے اِرادہ کیا ہے آنے کا
جو صحنِ دِل میں چلی ہے ہوائے بسم اللہ

نہیں تھی سہل غزل اِس زمین میں فرتاشؔ
فرازؔ و فیضؔ پہ بھی تھی عطائے بسم اللہ

غزلیں

—محمد افتخار شفیع—

تم گئے ہو تو گماں ہے کہ نہیں تھے ہم بھی   ورنہ۔۔۔ منہ جملۂ اربابِ یقیں تھے ہم بھی
قصہ گو! تو نے فراموش کیا ہے ورنہ   اس کہانی میں ترے ساتھ کہیں تھے ہم بھی
یہ الگ بات کہ تجھ حسن کو منظور نہ تھا   ورنہ خوش فہم تو خود اپنے تئیں تھے ہم بھی
اب جو لوٹے ہیں حیران کھڑے سوچتے ہیں   یہ مکاں وہ تو نہیں جس کے مکیں تھے ہم بھی

دِل پہ لکھی تھی جو تحریر مٹاتے کیسے
لاکھ کم فہم سہی آئینہ بیں تھے ہم بھی

اِک ہجر ہے اور اس کا بیاں کچھ بھی نہیں ہے   اے عشق! مرے پاس یہاں کچھ بھی نہیں ہے
ہر چشم کو منظر کیا اِک جلوہ نما نے   ورنہ تو بجز عکسِ بتاں کچھ بھی نہیں ہے
کچھ پیڑ بہت دیر سے خاموش کھڑے ہیں   بستی میں مسافر کہ مکاں کچھ بھی نہیں ہے
اِک یاد شبِ رفتہ کے مرقد پہ چڑھی یاد   ورنہ یہ چراغوں کا دھواں کچھ بھی نہیں ہے
یہ دشت ہماری بھی گزرگاہ تھا لیکن   اس دشت میں اے راہرواں! کچھ بھی نہیں ہے

ہر شے ہے یہاں صورتِ مہ تابِ اُفق تاب
اس رات کے پردے میں نہاں کچھ بھی نہیں ہے

غزل

—محمد اکرام الحق قاسمی—

عقل سے روز پوچھتا کیا ہے
آتشِ عشق میں رکھا کیا ہے

دیکھ کر تجھ کو آنکھ خیرہ ہوئی
اِس تجلّی کا ماجرا کیا ہے

آ گیا ہوں فنا کی منزل تک
اب بتا اِس سے ماورا کیا ہے

کیوں کنارہ مجھے نہیں ملتا
کشتیٔ نوح کو ہوا کیا ہے

جسم دُنیا نے کھا لیا اکرامؔ
زندہ رہنے کی یہ سزا کیا ہے

غزلیں

—محمد آصف مغل—

اس اماوس میں کسی شوخ بدن کی خوشبو		جیسے صحرا میں چلی آئے چمن کی خوشبو
تو بھی مہکے کبھی اس رات کی رانی کی طرح		تیرے ہونٹوں پہ بھی آئے تیرے من کی خوشبو
ہم نے سر رکھ کے ہتھیلی پہ جلائے ہیں چراغ		ہم کو مانوس رہی دار و رسن کی خوشبو
رات کس کنجِ گل و لالہ سے ہو کر گزرے		صبح کپڑوں سے ملی سرو و سمن کی خوشبو

میرا اس خاک سے ایمان کا ہے رشتہ آصفؔ
میری سانسوں میں مہکتی ہے وطن کی خوشبو

ادھر تو دیکھ بدن ہے لہو لہو میرا		تھکا نہیں ہے مگر ذوقِ جستجو میرا
میں اپنی جاں سے بھی ہنس کر گزر ہی جاؤں گا		بس ایک بار وہ کہہ دے مجھے ہے تو میرا
یہ دین ہے تو اسی پیار کی مرے ساجن		کہ تذکرہ ہے ترا اور کوبکو میرا
میں آج بھی اِسی جا بیٹھتا ہوں جا کے وہاں		اور انتظار بھی کرتی ہے آبجو میرا
مئے خیال تسلسل سے پی رہا تھا میں		کسی نے خالی نہ ہونے دیا سبو میرا
میں کہہ کے تو نہ بلاتا اسے کبھی کہ یہی		اسے پسند تھا اندازِ گفتگو میرا

وہ اب تو میری طرح سوچتا ہے اے آصفؔ
ہے گفتگو میں بھی انداز ہوبہو میرا

غزلیں

—مظہر بخاری—

آپ چاہیں تو کچھ کلام کروں ورنہ مَیں اور کوئی کام کروں
کیا تمہاری خوشی اِسی میں ہے روز آ کر تمہیں سلام کروں
روشنی راز فاش کر دے گی تیرگی کا کچھ انتظام کروں
صبح کو رنگ دوں نظاروں سے اور رنگین کوئی شام کروں
جان و دِل کب کا تم ہ وار چکا اور کیا کیا تمہارے نام کروں
مَیں منافق نہیں بڑے صاحب! کس لیے خود کو زیرِ دام کروں
تم کو جانِ غزل کہوں مظہرؔ تم پر روئے سخن تمام کروں

کوئے دِلدار کا مکیں رہے گا چاند خوابوں کی سرزمیں رہے گا
کھل گیا جس پہ تیرے عشق کا رنگ معجزوں پر اُسے یقیں رہے گا
جس کو رنگِ سخن عطا ہو ترا رونقِ بزمِ نغمگیں رہے گا
رات بھر تجھ سا کوئی مصحفِ نور آنکھ میں وقفِ خواب گیں رہے گا
لذتِ وصل سے ہمیں کیا کام ہجر ہی وجہِ انگبیں رہے گا
اپنی تکمیل سے ڈرا ہوا شخص لمحہ بھر چاک پر نہیں رہے گا
تجھ سے شکوہ نہیں ہے شہزادی عمر بھر کون ہم نشیں رہے گا
غم کی یورش ہو یا خوشی مظہرؔ
تیرا اندازِ دِلنشیں ، رہے گا

غزلیں

—ناصر ملک—

اِک نہ اِک روز میں پھر تیرے نگر آؤں گا
کاٹ کر درد کی لہروں کا سفر آؤں گا

یعنی تجدیدِ تعلق کی طلب ہے مجھ کو
طے نہیں تجھ سے ملاقات مگر آؤں گا

سچ ہے تنہائی میں رستہ نہیں کٹتا پیارے
لے کے ماضی کی اُداسی کا ثمر آؤں گا

تو نے تنہائی میں یادوں کو نیا موڑ دیا
میں تری سوچ کے دامن میں اُتر آؤں گا

حوصلہ لے کے زمانے کے رواجوں کے لیے
میرا وعدہ ہے کہ اے جانِ جگر آؤں گا

پھر کسی روز بھلانے کا ارادہ لے کے
تیری یادوں کے سمندر میں اُتر آؤں گا

صبحِ نو میری رات کر جائے
معتبر مِری ذات کر جائے

اجنبی راستوں پہ نکلا ہوں
کچھ دُعائیں ہی ساتھ کر جائے

کچھ تو بولے وہ پھول لہجے میں
پیار کی کوئی بات کر جائے

اُس کے جادو کا بانکپن دیکھو
ہنس کے بازی ہی مات کر جائے

مانتا ہوں جدائی حتمی ہے
کوئی حتماً ہی بات کر جائے

کیسا روشن منش ہے وہ ناصرؔ
جو میرے دِن کو رات کر جائے

غزلیں

—نصرت صدیقی—

تمام عمر تڑپنے کا حوصلہ نہ ہوا
تری جدائی کا ہم سے بھی حق ادا نہ ہوا

یہاں نصیب کسے مستقل ٹھکانہ ہوا
جو شب کو رُک بھی گیا صبح کو روانہ ہوا

اب آئے ہو تو مری روح میں اُتر جاؤ
تمہیں قریب سے دیکھے ہوئے زمانہ ہوا

یہ آئے دن کے حوادث کا فیض ہے شاید
کہ زندگی کا چلن اور باغیانہ ہوا

الٰہی ! خیر مرے دوستوں میں شامل ہے
وہ شخص جس سے کبھی کسی کا بھلا نہ ہوا

ہمیں تو جلنا تھا ہم اپنی آگ میں جلتے
تمہاری یاد میں جلنا تو اِک بہانہ ہوا

برے بھلے سبھی مجھ کو عزیز ہیں نصرتؔ
کہ سب سے درد کے رشتے سے دوستانہ ہوا

رابطہ روح نے اجسام سے رکھا ہوا ہے
ایک رشتہ کئی اصنام سے رکھا ہوا ہے

گوشہ دل کی پناہوں میں چھپا کر میں نے
اس کو محفوظ ہر الزام سے رکھا ہوا ہے

کوئی حسرت نہیں دل میں تری چاہت کے سوا
دل کو محفوظ ترے نام سے رکھا ہوا ہے

اس کی مخمور نگاہی کے تعاون کے طفیل
فاصلہ گردشِ ایام سے رکھا ہوا ہے

رنگ و خوشبو میں بسا دیتا ہے دل کا صحرا
وہ جو رشتہ کسی گلفام سے رکھا ہوا ہے

زندگی قید کی مانند ہے لیکن اس نے
قید میں بھی مجھے آرام سے رکھا ہوا ہے

میرے خوابوں کی بھی تعبیر تو ہوگی کوئی
بے خبر کیوں مجھے انجام سے رکھا ہوا ہے

مجھ کو معلوم نہیں ہے یہ قضا جانتی ہے — زندگی نے مجھے کس کام سے رکھا ہوا ہے
اب سحر تک مجھے جلنا ہے بجائے اس کے — جو دیا طاق میں کل شام سے رکھا ہوا ہے

جزوِ پیغمبری میرا بھی سخن ہے نصرتؔ
میں نے بھی اوسطہ الہام سے رکھا ہوا ہے

پھولوں سے ہوتی ہوتی رُخِ یار تک گئی — ہر شخص کی نظر مرے معیار تک گئی
یہ فیصلہ تو وقت ہی کر پائے گا کبھی — کس کس کی فکر جراتِ اظہار تک گئی
جب بھی غزل کا مجھ سے کوئی شعر ہو گیا — احباب کی نظر مرے کردار تک گئی
اِتنی بڑھی کہ بڑھ کے وہ عنوان بن گئی — چھوٹی سی کوئی بات جو اخبار تک گئی
غیرت کا سودا کر گئے فاقوں سے مرتے لوگ — فکرِ معاش جبہ و دستار تک گئی
آلامِ روزگار نے رسوا کیا مجھے — رودادِ عشق جب ترے انکار تک گئی
شدت سے یاد آئی ہے ماں باپ کی مجھے — سایوں کی بات جب گھنے اشجار تک گئی
یوسف نہیں تھا پھر بھی کئی بار میں بِکا — اُس کی گلی بھی مصر کے بازار تک گئی

نصرتؔ کہاں سے آ گئیں لہجوں میں تلخیاں
صوت و صدا کی کاٹ بھی تلوار تک گئی

تشنہ کامِ آرزو رکھا پذیرائی نہ دی — زخم تو مجھ کو دیے زخموں کو گہرائی نہ دی
میرے بچوں کو کھلونوں سے وہی رغبت رہی — میری مجبوری نے معصوموں کو دانائی نہ دی
دشمنوں سے بارہا کھائے فریبِ دوستی — تجربوں نے بھی بسا اوقات بینائی نہ دی
میں فرازِ دار تک سچ کے سہارے آ گیا — جھوٹ کی پستی نے تیرے قد کو اونچائی نہ دی
ہر نفس تیرا تصور ہر گھڑی تیرا خیال — تیری یادوں نے تو اِک پل کی بھی تنہائی نہ دی
دیکھتے ہی دیکھتے ہر چیز مہنگی ہوگئی — وقت نے خونِ بنی آدم کو مہنگائی نہ دی

وہ اُجالا کیا اُجالا دل کا ہویا روح کا
یورشِ ظلمت کو نصرتؔ جس نے پسپائی نہ دی

غزلیں

—واصف سجاد—

نکلیں گے بے یقینی کے گہرے عذاب سے — گر رابطہ بحال ہو اپنا کتاب سے
میں جانتا ہوں تیری حقیقت جہانِ نو — مرعوب میں نہیں ہوں تری آب و تاب سے
امروز کے عذاب میں جو مبتلا ہے خلق — بہلا رہے ہیں سب اسے فردا کے خواب سے
کیا دے انھیں سکون کوئی لمحۂ فراغ — لذت کشید کرتے ہیں جو اضطراب سے
چھن چھن کے آ رہی ہے تب و تابِ زندگی
پردہ سرک رہا ہے رُخِ انقلاب سے

زمین میرے لیے آسمان میرے لیے — بنا ہے سارے کا سارا جہان میرے لیے
بچھے ہوئے ہیں یہ سب راستے مری خاطر — اور ان میں راہنما ہر نشان میرے لیے
کہ جس میں مرکزی کردار خاکسار کا ہے — خدا نے لکھی ہے وہ داستان میرے لیے
چلو ہم اس پہ بھی خوش ہیں اگر بنیں اِک ساتھ — تمہارے واسطے گھر اور مکان میرے لیے
بہت ہی سوچ سمجھ کر گزارنا ہے اسے — کہ یہ حیات ہے اِک امتحان میرے لیے
میں اوجِ انجم و مہتاب سے نہیں مرعوب
ہے ان سے بڑھ کے مرا خاکدان میرے لیے

غزل

—یونس اعجاز—

رنگ و بو کے دوش پر ہلچل مچائے گی بہار
در مقفل ہے تو روزن کھٹکھٹائے گی بہار

چاند چہرے ، سروقد ، مخمور آنکھیں ، گلبدن
تجھ کو چُھو جائے تو ہر جادو جگائے گی بہار

اتنے تھوڑے رتجگے سے دوست کیوں اُکتا گئے
گویا آنکھیں موند لینے سے ہی آئے گی بہار

تم جدھر جاؤ اُدھر اُتریں صبا کے قافلے
تم جہاں ٹھہرو وہیں خیمے اُگائے گی بہار

شورِ بلبل کس نے روکا ، خوشبوئیں ٹھہریں کہاں
میری چپ پر میرے نغمے گنگنائے گی بہار

بجھ گئی اعجاؔز تا حدِنظر پھولوں کی راکھ
اب یقیناً پاؤں اس جانب بڑھائے گی بہار